ماہنامہ

خالد

اگست ۱۹۸۳ء

(ایڈیٹر مرزا محمد الدین ناز)

فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ

ع تیرے لیئے اسے خوش نصیب تھا آسماں روتا رہا

سلسلہ عالیہ احمدیہ کے انتہائی مخلص بے لوث خادم، متبحر عالم اور قابل فخر داعی الی اللہ
حضرت مولانا عبدالمالک خان صاحب ایک تبلیغی سفر پر لاہور جاتے ہوئے ایک حادثہ میں
انتقال کر گئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کا ترجمان

جلد ۳۰

شمارہ ۱۰

ایڈیٹر: مرزا محمد الدین ناز

نائب ایڈیٹر: منیر احمد جاوید

معاون ایڈیٹر: مبشر احمد ایاز

قیمت سالانہ: ۱۰ روپے

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے

ماہنامہ خالد ربوہ

ماہ ظہور ۱۳۶۲ ہش اگست ۱۹۸۳ء

مندرجات

پبلشر: مبارک احمد خالد * پرنٹر: سید عبدالحی * مطبع: ضیاء الاسلام پریس ربوہ

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ خالد ۔ دارالصدر جنوبی ۔ ربوہ

کتابت: نورالدین خوشنویس ۔ دارالعلوم غربی ۔ ربوہ * رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۸۲۰

اداریہ

حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ

۱۴ اگست کا یوم سعید مسلمانان برصغیر کے لئے حریت و آزادی کے پیامبر کی حیثیت سے خریطۂ عالم پہ اُبھرا۔ پاک سرزمین۔ کروڑوں آرزوؤں کی منزل حسین، اسلاف کی تابندہ روایات کی امین، مذہب اسلام کے لئے حصن حصین اسم بامسمّٰی پاکستان مسلمانوں کی آماجگاہ اور مرکز بنا۔

ایک باہمت اور پُر عزم قیادت کے زیر نگیں ہر ایک اس جذبہ سے مملو تھا کہ ....

اس وطن عزیز سے — امریکہ کی استعماریت، روس کی استبدادیت، برطانیہ کا فلسفۂ نظریات، ہندوؤں کی جاہلانہ رسومات حرف غلط کی طرح محو کر دی جائیں گی۔ اور

آزادئ ضمیر کی ضامن اور آزادئ افکار و نظریات کی علمبردار اور مذہبی رواداری کی حامل اس کشور حسین میں اسلام کا غلغلہ ہوگا۔ توحید کا ڈنکا بجے گا۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اسی کی الوہیت کے گیتوں سے فضا معمور ہوگی۔

حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور انہیں کے بیان فرمودہ احکامات و ارشادات کی روشنی سے اس سرزمین کا ہر ذرہ منوّر ہوگا۔

اسلام کی حسین تعلیمات ہر آنگن میں جلوہ گر ہو کر اپنی خوشبو سے ہر قلب کو مخمور کر دے گی۔

لیکن ؎

واے ناکامی! متاع کارواں جاتا رہا
اور کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

پاکستان کے اشد ترین مخالفین جو پاکستان کی "پ" بننے کے بھی خلاف تھے اور اس منزل کے حصول میں قیادت عظمیٰ کے راستے کو خارزار میں تبدیل کرنے کے لئے کوشاں رہے اب منزل کو پانے کے بعد خدع کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر وطن کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن درپردہ فساد، انتشار اور افتراق کی سازشوں سے ملک کی فضا کو مسموم کر رہے ہیں۔

ہاں چند محبّ وطن ایسے بھی ہیں جو سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ

علیہ وسلم کے اِس فرمان "حُبُّ الوطنِ مِنَ الایمانِ" کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ وہ وفا شعاری، اخلاص اور حبّ الوطنی کے جذبہ سے ایسے سرشار ہیں کہ

اہلِ وطن کے ہر قسم کے سلوک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُن کے خون کا ہر قطرہ ارضِ پاک کی حفاظت اور سربلندی کے لیئے ٹپکنے کو بے تاب ہے۔

ان کے بعض جری سپوتوں نے صفِ اوّل میں جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اور اپنے غازۂ خون سے لبِ کشورِ پاک کو زینت بخشی۔

ان کے بعض اہلِ دانش و فکر نے اپنی ساری استعدادوں اور صلاحیتوں کو وطنِ پاک کی عظمت، اس کی بین الاقوامی حیثیت اور اس کی تاریخی اہمیت کو اُجاگر کرنے میں تج کر دیا۔

ان کے بعض قیمتی وجودوں نے اس کی تاریخ میں ایسا دوامی رنگ بھرا کہ آئندہ نسلیں اس کی رنگینیوں سے مستفیض ہوتی رہیں گی۔

ان کے امام ہمام کی مدھ بھری اور سریلی آواز اب بھی فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر کے ہر محبّ وطن کے قلب کو گرما اور ہر رُوح کو مچلا رہی ہے :-

"یہ ہمارا ایمان ہے کہ آج دُنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ سچّائی اور وفا کے ساتھ اگر کوئی اپنے وطن سے محبّت کرتا ہے اور وطن کی محبّت جس کا جزوِ ایمان بن گئی ہے تو وہ جماعتِ احمدیہ کے افراد ہیں"۔

"ہم بہر حال اس وطن کے لیئے ہر خطرے میں انشاء اللہ سب سے آگے کھڑے ہوں گے۔ ہر وہ تیر جو اس وطن کی طرف چلایا جائے گا احمدیوں کی چھاتیاں سب سے آگے ہونگی ان تیروں کو لینے کے لیئے"۔

کاش یہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہر ایک کے لیئے روشنی کا مینار ثابت ہو۔ اور ہر وجود اس وجودِ باجود کے ہم آہنگ ہو کر نہ صرف پاکستان بلکہ سارے عالم میں اسلام کی حسین روایات کو ترویج دیں تا پاکستان کی حقیقی عظمت قائم ہو۔ آمین ۞

"آسماں پر دعوتِ حق کے لئے اک جوش ہے"

ایمان کے ساتھ عمل ضروری ہے۔ اور عمل میں اسلام نے مناسبِ حال عمل کو ترجیح دی اور پسند کیا ہے یعنی یہ کہ وقت کی مناسبت سے کام کیا جائے۔

جماعتِ احمدیہ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ نظامِ خلافت قائم ہے اور جماعت کو صحیح رہنمائی امامِ وقت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اس وقت حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں داعی الی اللہ کا عظیم کام سرانجام دینے کی تحریک فرمائی ہے۔

لوگوں کو اللہ کی طرف دعوۃ دینے کے بابرکت فریضہ کے بارے میں قرآن شریف میں تاکید ہے :-

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ

اے رسول! جو پیغام تیری طرف نازل کیا گیا ہے اسے خوب کھول کھول کر پہنچا۔

ہم خدامِ احمدیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ غلاموں میں سے ہیں ہمیں آپ کے اُسوۂ حسنہ کو اپناتے ہوئے دعوۃ الی اللہ کے فرائض کو سرانجام دینا ہوگا۔

آج حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے جماعتِ احمدیہ اس فریضہ کو ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے نیک طبع لوگ اسکے نتیجہ میں حق کو قبول کر رہے ہیں۔

خدام الاحمدیہ کو بھی بغور جائزہ لینا ہوگا کہ وہ اس نیک و عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے میں کس حد تک فعّال ہے۔ بلاشبہ یہ بہت مبارک اور نیک کام ہے۔ اس کام میں سبقت لے جانے کے لئے نوجوان کمربستہ ہوں حُسنِ عمل، عمدہ اخلاق، مسلسل جدوجہد اور خدا کے حضور آنسوؤں کے ساتھ التجا کرتے ہوئے آگے بڑھیں! اور حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو مدّنظر رکھتے ہوئے (جو آپ اپنے متعدد خطبات میں فرما چکے ہیں) اپنے بھائیوں تک دعوتِ حق پہنچانے کی سعی کریں۔

اے ہمارے پیارے خدا! ہم کمزور تیرے عاجز بندے دعوۃِ اسلام کے لئے اپنی حقیر قربانی پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہماری کوتاہی کو معاف کرتے ہوئے ہماری حقیر قربانی کو قبول فرما کر ہمیں صحیح معنوں میں داعی الی اللہ بننے کی توفیق عطا فرما۔

—— صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ ——

پاکستان کے پیچھے خدائی طاقت کارفرما ہے"!

بیس سال قبل سیدنا المصلح الموعود رضی اللہ عنہ نے بھی جماعت احمدیہ پاکستان کے لیے اجتماعی دعاؤں کی طرف خاص توجہ دلائی تھی۔ چنانچہ حضور نے فرمایا:۔

"حکومت کا ان حالات میں بچ جانا جن سے پاکستان گزرا ہے پھر اس کا ترقی اور عزت حاصل کر لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا اس میں کتنا ہاتھ ہے۔ اگر پاکستان طاقت کے زور سے بنتا تو یہ ناممکن تھا لاکھوں آدمی مارا جا رہا تھا۔ گولہ بارود ہندوستان میں رہ گیا تھا۔ فوجیں باہر تھیں۔ ان حالات میں وہ کونسی طاقت تھی جس کے زور سے پاکستان بنا۔ روپیہ اُدھر تھا، سامانِ جنگ اُدھر تھے، کام کرنے والے اُدھر چلے گئے۔ دس بیس لاکھ کے قریب آدمی مارے گئے۔ یہ صرف خدائی طاقت تھی جس کی وجہ سے پاکستان کا رعب پڑ گیا..... پاکستان کا قائم رہنا اور بیرونی دنیا میں اس کا مشہور ہو جانا اس میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ خدا تعالیٰ جس کی نصرت پر آتا ہے کوئی طاقت اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔"

(الفضل ۱۷ نومبر ۱۹۵۱ء صـ۳)

پاکستان سے متعلق ایک حیرت انگیز خبر

"پاکستان کا مسلمانوں کو مل جانا اس لحاظ سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے سانس لینے کا موقع میسر آگیا ہے اور وہ آزادی کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اب ان کے سامنے ترقی کے اتنے غیر محدود ذرائع ہیں کہ اگر وہ ان کو اختیار کریں تو دنیا کی کوئی قوم ان کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتی اور پاکستان کا مستقبل نہایت ہی شاندار ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی پاکستان ایک چھوٹی چیز ہے ہمیں اپنا قدم اس سے آگے بڑھانا چاہیئے اور پاکستان کو اسلامستان کی بنیاد بنانا چاہیئے۔ بے شک پاکستان بھی ایک اہم چیز ہے۔ بے شک عرب بھی ایک اہم چیز ہے۔ بے شک حجاز بھی ایک اہم چیز ہے۔ بے شک مصر بھی ایک اہم چیز ہے۔ بے شک ایران بھی ایک اہم چیز ہے مگر پاکستان اور عرب اور حجاز اور دوسرے اسلامی ممالک کی ترقیات صرف پہلا قدم ہے اصل چیز دنیا میں اسلامستان کا قیام ہے۔ ہم نے پھر سارے مسلمانوں کو ایک ہاتھ پر اکٹھا کرنا ہے۔ ہم نے پھر اسلام کا جھنڈا دنیا کے تمام ممالک میں لہرانا ہے۔ ہم نے پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام عزت اور آبرو کے ساتھ دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا ہے۔ ہمیں پاکستان کے جھنڈے بلند ہونے پر بھی خوشی ہوتی ہے۔ ہمیں مصر کے جھنڈے بلند ہونے پر بھی خوشی ہوتی ہے۔ ہمیں عرب کے جھنڈے بلند ہونے پر بھی خوشی ہوتی ہے۔ ہمیں ایران کے جھنڈے بلند ہونے پر بھی خوشی ہوتی ہے۔ مگر ہمیں حقیقی خوشی تب ہو گی جب سارے ملک آپس میں اتحاد کرتے ہوئے اسلامستان کی بنیاد رکھیں۔ ہم نے اسلام کو اس کی پرانی شوکت پر قائم کرنا ہے ہم نے خدا تعالیٰ کی حکومت دنیا میں قائم کرنی ہے۔ ہم نے عدل اور انصاف کو دنیا میں قائم کرنا ہے اور ہم نے عدل اور انصاف پر مبنی پاکستان کو اسلامک یونین کی پہلی سیڑھی بنانا ہے۔ یہی اسلامستان ہے جو دنیا میں حقیقی امن قائم کرے گا اور ہر ایک کو اس کا حق دلائے گا۔ جہاں روس اور امریکہ فیل ہوا صرف مکہ اور مدینہ ہی انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔" (خطاب سیدنا المصلح الموعودؓ بر موقعہ جلسہ لاہور ۱۹۴۷ء)

محمد ظفر اللہ خاں قائدِ اعظم کی نظر میں

مسٹر فرخ امین قائدِ اعظم کی سیرت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب اُنھوں نے (قائدِ اعظم نے ۔ ناقل) یو۔این۔او میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے سر محمد ظفر اللہ خاں کو پورے اختیارات دینے کیلئے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کیے "
(ماہِ نو کراچی ۔ نومبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۸)

" جب قائدِ اعظم نے یہ چاہا کہ آپ پنجاب باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہوں اور ظفر اللہ خاں نے فوراً یہ خدمت سرانجام دینے کی حامی بھری ۔ جو افراد کمیشن کے ارکان کی حیثیت سے جج بنا کر بٹھائے گئے تھے وہ باعتبار تجربہ و صلاحیت آپ کے مقابلہ میں طفلانِ مکتب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے ۔ لیکن قائدِ اعظم کی خواہش تھی کہ ظفر اللہ کمیشن کے سامنے ملّت کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہوں ۔ اس لئے آپ نے بلا تامل یہ کام اپنے ذمہ لیا اور اسے ایسی قابلیت سے سرانجام دیا کہ قائدِ اعظم نے خوش ہو کر آپ کو یو۔این۔او میں پاکستانی وفد کا قائد مقرر کر دیا جس طرح آپ نے ملّت کی وکالت کا حق ادا کیا تھا اس سے آپ کا نام پاکستان کے قابلِ احترام خادموں کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا ۔

آپ نے مُلک و ملّت کی جو شاندار خدمات سرانجام دیں تو قائدِ اعظم انہیں حکومتِ پاکستان کے اس عہدے پر فائز کرنے پر تیار ہو گئے جو باعتبار منصب وزیرِ اعظم کے بعد سب سے اہم اور وقیع عہدہ شمار ہوتا ہے ۔ قائدِ اعظم نے چوہدری صاحب کو بلا تامل پاکستان کا وزیرِ خارجہ بنا دیا ۔ لیکن ظفر اللہ کے ہاتھوں وہ زبردست کارنامہ انجام دینا باقی تھا جس سے اس کا نام تاریخِ پاکستان میں ہمیشہ زندہ رہے گا "

(روزنامہ نوائے وقت ۲۴ اگست ۱۹۴۸ء)

(تینتیس ۳۳ سال قبل کی تاریخ)

دُنیا کا ایک جلیل القدر ہیرو

(از جناب چوہدری محمد حسن صاحب ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری گجرات مسلم لیگ و ممبر جنرل کونسل)

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ تمام مہذب دُنیا آپ کے وزیر خارجہ کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے؟ تمام دُنیا کی متفقہ رائے ہے کہ ظفر اللہ خاں نے متعدد معاملات میں اپنے ملک کی اس زور، بے لاگ پن، صفائی، سنجیدگی اور معقولیت سے وکالت کی ہے کہ اس نے تمام دُنیا کی رائے کو پاکستان کا ہمنوا بنا لیا۔ کیا دُنیا کے عظیم المرتبت لوگوں نے اسکی عظیم الشان شخصیت، اسکی نورانی بصیرت، اسکی عام فہم منطق اور پُر زور انداز بیان اور مقاصد کی سنجیدگی کو خراج تحسین ادا نہیں کیا؟ اسلامی ممالک خصوصاً عربی دُنیا میں اس کو ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ وہ اقوام متحدہ میں ان کی طرف سے جو بھی لڑائی لڑتا ہے، اُن کے بوجھ اپنے سر پر اُٹھاتا ہے، اُن کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے اور اُن کے مقاصد کی اِس انداز میں ترجمانی کرتا ہے جس کا نظارہ اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ایسی عظیم شخصیت کی برطرفی کا مطالبہ اگر (مملکت کے) دوستوں کی طرف سے ہے تو یہ امر اُن کی خودکشی کے مترادف ہے اور اگر چھپے دشمنوں کی طرف سے ہے تو غداری کی بدترین مثال ہے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نے اپنی صحت اور دولت کی قربانی دیکر اسلام اور پاکستان کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور اِس طرح ایثار کا ایک بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔ لیکن افسوس کہ پانچ سال کی اَن تھک اور بے لوث خدمت اور ملک کے لئے اپنے آپکو ہمہ تن وقف کر دینے کا بدلہ قوم کی طرف سے اُس کو گالیوں، تہمتوں اور لعنت و ملامت کی شکل میں مل رہا ہے۔ اے احسان فراموشی! تیرا وجود عصبیت کا مرہونِ منّت ہے۔

اِس ملک کے لوگوں کو غور سے مصری اخبارات کے وہ تبصرے پڑھنے چاہئیں جن میں انہوں نے ہمارے وزیر خارجہ کی عظیم شخصیت کی تعریف میں اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے۔

..... ظفر اللہ ایک عظیم مسلمان، ایک محبِّ وطن پاکستانی اور ایک مثالی پنجابی ہے۔ ایسے موقعہ پر اس کو بدنام کرنا انتہائی کمینگی ہے جبکہ ملک کو اس کی خدمات کی سخت ضرورت ہے۔ اور ہندوستان کے ساتھ اپنے جھگڑوں کے سلسلہ میں ملک کی نمائندگی کرنے کے لیے سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھتی ہیں۔

(روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء)

سراپا شفقت

محمد اکرم عمر شاھد۔ مربی سلسلہ۔ ربوہ

کتنے پیار سے فرمایا۔ کمزور معلوم ہوتے ہو!
عرض کی۔ حضور! اسی لیے تو حاضر ہوا
ہوں۔
(پرائیویٹ سیکرٹری صاحب سے مخاطب ہو کر)
انہیں مابل دے دیں۔
مابل: حضور کی تیار کردہ دوائی جس کا
نام آپ نے محافظ الاجساد باذن اللہ رکھا تھا۔
(پھر میری طرف توجہ فرما کر) روزانہ
ایک ایک گولی کھانی ہے زیادہ نہیں۔
خاکسار فرحاں و شاداں دوائی لیکر حضور
کو دل میں دعائیں دیتا ہوا ہوسٹل پہنچ گیا۔
کیا پیار کرنے والا وجود تھا۔ اپنے ناچیز خادم کی
صحت کا آپ کو کس قدر خیال تھا۔
جب کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو کسی
نے مشورہ دیا ڈوثرن امیر و کر لو۔ کسی نے کہا
آگے تعلیم جاری رکھو۔ کسی نے کہا کوئی جاب
(JOB) اختیار کر لو۔ اسی کشمکش و پیچ میں حضور
کے پاس پہنچ گیا۔ اور سب باتیں لکھ کر پیش

کر دیں۔ پڑھ کر پہلے نمبر پوچھے پھر فرمایا "میرا
دیانتدارانہ مشورہ یہ ہے کہ تم جامعہ میں چلے جاؤ
مَیں تمہارے لیئے دعا کروں گا۔"
گویا آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی
ہو۔ خوشی خوشی واپس آیا۔ پرنسپل صاحب جامعہ
احمدیہ سے ملا۔ اُن کے کہنے پر وکالت دیوان
میں فارم وقفِ زندگی پُر کیا۔ اور جامعہ میں داخلہ
لے کر گھر والوں کو اطلاع کر دی۔ سب نے حضور
کے مقدس مشورے کو پسند کیا۔
اور یہ حضور کی دعاؤں کا اثر تھا کہ خاکسار
ہر سال اپنی کلاس میں اول آتا رہا۔ الحمد
للہ علیٰ ذٰلک۔
جامعہ احمدیہ میں تعلیم کے دوران حضور کی
اجازت سے ہم پانچ دوستوں نے سرگودھا بورڈ میں
فاضل عربی کا امتحان دیا۔ جب رزلٹ آؤٹ
ہوا تو ایک دوست کو بورڈ میں بھیج کر نمبروں کا
پتہ کرایا۔۔۔ اُس نے آ کر یہ خوشخبری سنائی کہ
اللہ کے فضل و کرم سے پانچوں نے پہلی پانچ

پوزیشنیں حاصل کی ہیں۔ ہمارے پرنسپل صاحب نے حضور کی خدمت میں اس کی اطلاع بھجوائی تو حضور اس قدر خوش ہوئے کہ غالباً دوسرے دن ہی ہمیں ملاقات کے لیئے بُلا بھیجا۔

جب ہم حضور کی خدمتِ اقدس میں پہنچے تو آپ کا چہرہ مبارک خوشی سے تمتما رہا تھا۔ آپ نے نمبر پوچھے۔ مبارکباد دی ـــــ پھر جلدی سے شہد کی دو بوتلیں اُٹھا لائے۔ ایک مجھے دیتے ہوئے فرمایا:۔

"لو شہد پیو۔ یہ ایک تمہارے لیئے ہے کیونکہ تم فرسٹ آئے ہو اور باقی ایک اِن سب کے لیئے ہے"

حضور کے اس عطا کردہ انعام اور تبرّک میں کتنے عزیز اور کتنے دوست شامل ہوئے اور کس چاہت سے اُنہوں نے اُس تبرّک میں سے حصہ لیا یہ الگ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

بہرحال یہ تھا ہمارا پیارا آقا، سراپا شفقت، امن کا سفیر، مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالث، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اے جانے والے! ہم تیری نیک یادوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے انشاء اللہ۔

اے اللہ! اس سراپا شفقت وجود کو اعلیٰ علیین میں بلند سے بلند مقام عطا کیجیو اور حضور کے درجات کو بلند سے بلند تر فرماتے چلے جائیو÷

ایک یاد، ایک عہد

نصیر احمد نجم - ہائیڈل برگ - مغربی جرمنی

عزیزانِ دیار! یہ مہینہ پاکستان کی آزادی کا مہینہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اسکے حصول کیلئے جو قربانیاں پیش کیں اُن سے بڑھ کر اس کی بقاء کیلئے ہمیں قربانیاں پیش کرنی ہیں۔ آج وطن کا یہی تقاضا ہے، یہی مطالبہ ہے۔ اس موقعہ پر ہمیں احبابِ جماعت کو سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا ایک تاریخ ساز عہد یاد دلاتا ہوں حضورؒ نے ۱۹۷۱ء کے سالانہ اجتماع انصاراللہ مرکزیہ کے تیسرے روز اپنے اختتامی خطاب میں حاضرینِ مجلس سے یہ عہد لیا کہ:۔

"مَیں اپنے وطن اور قوم کی حفاظت و سالمیّت کی خاطر ہر قربانی پیش کروں گا اور اِن حقیر قربانیوں کے بدلہ میں اپنے ربّ سے اُس کے انتہائی فضلوں اور رحمتوں کی اُمید رکھوں گا۔ انشاءاللہ"

پس اے احمدیو! آج مادرِ وطن ہم سے اپنی حفاظت و سالمیّت کے لئے قربانیوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ہم نے اس عہد کو نبھانا ہے۔ دعاؤں کے ساتھ مثالی قربانی پیش کر کے ہی ہم اس عہد کو نبھا سکتے ہیں۔ پس ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر قربانی کے واسطے ہر دم تیار رہیں اور پیارے آقاؒ کی یہ آواز ہر دم ہمارے کانوں میں گونجتی رہے کہ:۔

"تمہاری مادرِ وطن آج تمہیں بُلا رہی ہے۔ وہ تم سے قربانی چاہتی ہے تم اس کی آواز پر لبّیک کہتے ہوئے اسکے لئے ہر قربانی پیش کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ وطن کی سالمیّت اور حفاظت کے لئے تمہاری طاقتوں کا آخری جزو بھی خرچ ہو جانا چاہیئے۔ تمہارے ذہن ہر قربانی کے لئے تیار اور تمہارے عمل تمہارے ذہنی فیصلوں کی ہر وقت تائید کرنے والے ہوں۔ خدا کرے کہ سارے پاکستانی ہی مادرِ وطن کی سالمیّت پر ہر قربانی کے لئے تیار رہیں لیکن ایک احمدی کو تو بہر حال کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ صرف یہ نہیں کہ وہ کسی سے پیچھے نہ رہیں بلکہ انہیں دوسروں کی طرف دیکھے بغیر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔" (الفضل ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱-۶)

تا پیارے آقاؒ کے دل کی آواز کو پورا کر کے ہم خدا سے اسکی رضا پانے والے ہوں۔ یہ عہد پیارے آقاؒ کی ایک حسین یاد ہے۔ ہم نے پیارے آقا کی حسین یادوں کو زندہ رکھنا ہے پس آیئے اور وطنِ عزیز کی حفاظت و سالمیّت کیلئے ہر قسم کی قربانیاں پیش کر کے اِس عہد کو پورا کیجئے اور اس نیک یاد کو بھی زندہ رکھیئے کہ ہمارا وطن جس قربانی کا ہم سے مطالبہ کرے گا وہ ہم نے بے دریغ پیش کر دینی ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ آمین ؛

غزل

جناب ثاقب زیروی

نگاہِ حُسن کو سر در گریبان نے دیکھا ہے
محبّت کا یہ انجامِ پریشاں ہم نے دیکھا ہے

خدارا اپنے گیسوئے پریشاں کو یہ سمجھا دے
پریشاں کرنے والوں کو پریشاں ہم نے دیکھا ہے

نہ جانے کیا تعلّق ہے جنوں کا خستہ حالی سے
کہ دیوانوں کو اکثر چاکِ داماں ہم نے دیکھا ہے

بزعمِ خویش تنقیدِ گلستاں کے جو ماہر تھے
اِن آنکھوں سے اُنہی کو غم بداماں ہم نے دیکھا ہے

وہی ہے اصطلاحِ میکشاں میں رُوحِ میخانہ
تری آنکھوں میں جس مستی کو رقصاں ہم نے دیکھا ہے

یہ آنسو صرف آنسو ہی نہیں دل کی ضیائیں ہیں
شبِ غم اِن سے پلکوں پر چراغاں ہم نے دیکھا ہے

تصوّر کی یہ تیرے کارفرمائی ارے توبہ!
سکُوتِ شامِ ہجراں کو غزلخواں ہم نے دیکھا ہے

سفینوں کے بھروسے پر خدا کو بھُولنے والو!
سفینوں کو تو ہوتے غرقِ طوفاں ہم نے دیکھا ہے

بہارِ عشق میں داغِ محبّت سے ہے رنگینی
کہ اِس ویرانہ دل کو گلستاں ہم نے دیکھا ہے

اُن آنکھوں میں خزاں اب جاودانی ہو گئی ثاقب
جن آنکھوں سے کبھی جشنِ بہاراں ہم نے دیکھا ہے

گی آنا (جنوبی امریکہ) میں اسلام

(از غلام احمد صاحب نسیم ایم اے، ایم او ایل سابق مبلغ گی آنا۔ حال استاذ جامعہ احمدیہ)

تعارف:۔

گی آنا جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس علاقہ کو استعماری طاقتوں نے اپنی نوآبادیاتی یلغار کے وقت تین حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ اس طرح ان حصوں کے الگ الگ نام برٹش گی آنا، ڈچ گی آنا اور فرینچ گی آنا قرار پائے۔ ان میں سے برٹش گی آنا ۱۹۶۶ء میں آزاد ہو گیا اور صرف "گی آنا" (GUYANA) کے نام سے موسوم ہونے لگا۔ ڈچ گی آنا بھی آزاد ہو چکا ہے اور اب "سورینام" کہلاتا ہے۔ البتہ فرینچ گی آنا ابھی تک نوآبادی ہے۔

گی آنا (GUYANA) جس کے لفظی معنی LAND OF WATERS یعنی "پانیوں کی زمین" کے ہیں فی الحقیقت یہی نقشہ پیش کرتا ہے۔ ہر طرف دریا ہی دریا ہیں جن میں سے بعض غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ بعض جگہ ان کی چوڑائی میلوں میں ہے اکثر دریاؤں میں جہازرانی ہو سکتی ہے۔ مواصلاتی نظام بڑی بڑی جہاز نما کشتیوں کا مرہونِ منت ہے۔ آبادی زیادہ تر ساحلی علاقوں تک محدود ہے۔ اندرونی علاقے غیر آباد اور جنگلات سے اَٹے پڑے ہیں۔

آب وہوا:۔

آب وہوا معتدل ہے۔ بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ پیداوار میں گنا اور چاول مشہور ہیں۔ پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ گنے کی بہتات کی وجہ سے ضرورت سے کہیں زیادہ کھانڈ تیار ہوتی ہے جو یورپ کے ممالک کو برآمد کی جاتی ہے۔

تاریخ:۔

سترھویں صدی عیسوی سے قبل کی تاریخ پردۂ اخفاء میں ہے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں جب استعماری طاقتیں وہاں پہنچیں تو بغیر کسی بڑی مزاحمت کے اس علاقہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس وقت وہاں کے باشندے نہ تو جدید فنونِ حرب سے واقف تھے اور نہ ہی منظم تھے۔ نوآبادیاتی طاقتوں کو اگر کہیں لڑائی کرنی بھی پڑی تو وہ آپس میں ہی تھی۔ استعماری طاقتوں کے پہنچنے پر وہاں کے اصل

باشندوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لے لی۔ جہاں اب تک اُن کے گاؤں اور چھوٹی چھوٹی آبادیاں موجود ہیں۔

باشندے :-

گی آنا کے اصلی باشندوں کو امریکن انڈین یا ریڈ انڈین کہا جاتا ہے جو اب بہت ہی کم تعداد میں ہیں۔ نوآبادیاتی طاقتیں جب وہاں وارد ہوئیں تو اُن کو وہاں کی زرخیز زمین کی کاشت کیلئے موزوں لوگوں کی ضرورت پیش آئی۔ پہلے پہل اُنہوں نے غلاموں کو خریدا۔ جب ۱۸۶۳ء میں غلامی قانوناً ممنوع قرار پائی تو پرتگال، چین، انڈونیشیا اور ہندوستان سے ایسے لوگ لے جائے گئے جو گنّے کے کھیتوں اور شکر کے کارخانوں میں کام کر سکیں۔ اس طرح وہاں کی آبادی مختلف ممالک کے لوگوں کا مجموعہ بن گئی۔ گی آنا کی نصف آبادی انڈین، چالیس فیصد افریقن اور باقی پرتگالی، چینی اور دیگر یورپ کی اقوام پر مشتمل ہے۔ کم و بیش یہی حال سورینام اور فرینچ گی آنا کا ہے۔ البتہ سورینام میں انڈونیشی باشندے بھی آباد ہیں۔

جزائر غرب الہند :-

گی آنا کی آبادی، تمدن اور مذہبی حالات کو جزائر غرب الہند "WEST INDIES" سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ گی آنا پہنچنے والے لوگ انہی جزائر کو ذریعہ بناتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اب بھی اس علاقہ کے روابط جزائر غرب الہند سے مربوط ہیں۔ اور گی آنا میں اسلام کی داستان ان جزائر سے الگ ہو کر بیان نہیں کی جا سکتی۔ جزائر غرب الہند بحر اوقیانوس میں واقع ان چھوٹے بڑے جزائر کو کہا جاتا ہے جن کی دریافت کا آغاز کولمبس کے سفرِ مغرب سے ہوا۔ کولمبس سپین سے مغرب کی طرف روانہ ہوا تا وہ مغرب کی طرف سے ہندوستان پہنچے۔ جب اِن جزائر میں پہنچا تو اُس نے خیال کیا کہ وہ ہندوستان کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اور یہی جزائر یورپ کو مغرب کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اِس وجہ پر ان جزائر کو غرب الہند کا نام دیا گیا ہے۔

۱۷ ویں صدی سے اِن جزائر کی تاریخ نمایاں ہوتی ہے جبکہ برطانیہ اور فرانس نے شکر کی تلاش میں اِن جزائر کو شکر کی پیداوار کے لیئے بہت موزوں پایا۔

غلامی :-

غلامی کی داستان کا تاریک ترین دَور شکر سازی کی اس ہوس کی کہانی کے ساتھ ساتھ اُبھرتا ہے۔ چونکہ گنّے کی پیداوار اور اس کی نقل و حمل کے لیئے مضبوط جسم کے لوگ درکار تھے اور یورپ کے رہنے والے اپنے آپ کو اس کٹھن کام کے لیئے پیش کرنے کو تیار نہ تھے ــــــ پلانٹرز (PLANTERS) کی نظر فوراً افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کی طرف مبذول ہوئی۔ اس سے قبل پرتگال کم و بیش دو صدیوں سے مغربی افریقہ کے غلاموں کی تجارت میں مصروف تھا۔

صحیح وقت اور زمانہ کا تعین قریباً قریباً
ناممکن ہے کہ کب افریقہ کے باشندے "نئی دنیا" میں
پہنچے یا پہنچائے گئے۔ ہوسکتا ہے کہ کولمبس کے پہلے
سفر میں کوئی نہ کوئی موجود ہو لیکن اس سلسلہ میں حتمی
طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعد میں سپین کی حکومت نے
غلاموں کی تجارت کے لئے باقاعدہ اجازت نامے
جاری کئے اور اس طرح غلاموں کو جزائر غرب الہند
اور گی آنا وغیرہ میں لایا گیا۔ اجازت ناموں میں یہ شرط
ہوتی تھی کہ وہ عیسائی ہوں۔ اس تجارت کا گُھنا تھا کہ
لاکھوں کی تعداد میں غلاموں کو ان علاقوں میں پہنچا دیا
گیا۔

جان ہاکن (JOHN HAWKIN) ایک انگریز
تاجر کے بارہ میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا
جس نے مغربی افریقہ کے پرتگالی علاقہ سے غلاموں کی
تجارت کا آغاز کیا۔ ۱۵۶۲ء میں اس نے لنڈن کے
بعض تاجروں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور اس طرح
غلاموں کی تجارت کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔
جونہی غلاموں کی تجارت جائز قرار پائی کئی تاجر اس
میدان میں اُتر آئے اور افریقہ کے قبائلی سرداروں
نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہزارہا انسانوں
کو ان تاجروں کے ہاتھوں فروخت کرنا شروع کر دیا
بلاوجہ لڑائی شروع کر کے جنگی قیدی بنایا جاتا اور
پھر بطور غلام بیچ دیا جاتا۔ جوں جوں غلاموں کی
قیمت بڑھتی گئی جنگ کی صورت یہ ہو گئی کہ ایک
قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چھوٹا موٹا حملہ کر دیتا اور کچھ
لوگوں کو پکڑ کر یورپ کے تاجروں کے ہاتھ بیچ ڈالتا
نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ بعض اوقات قبائلی
سردار اپنے قبیلہ کے آدمی ہی تاجروں کے ہاتھ
فروخت کر دیتے۔

چونکہ غلام جنگی قیدی ہوتے تھے اور بعض
دفعہ ان میں کسی قبیلہ کے سردار یا اس کے رشتہ داروں
کو بھی غلام بننے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے
جب وہ اکٹھے ہوتے تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی ایسا
آدمی نکل آتا جو اُن کو منظم کرے۔ چنانچہ ۱۷ ویں
صدی میں بہت سے مقامات پر ان غلاموں نے
بغاوتیں بھی کیں۔ بغاوتوں سے بچنے کے لئے مالک
یہ کرتے کہ اُن کو آپس میں رابطہ قائم کرنے سے
روکتے۔ بعض اوقات مذہبی رسوم کی ادائیگی سے
بھی روک دیا جاتا۔ شادی بھی نہ کرنے دی جاتی۔
اور اُن کے بچوں کو دوسری جگہ بھیج دیا جاتا۔
باغی کی سزا میخوں سے لکڑی کے تختوں پر پیوست
کر کے جلا دینا تھی۔ غلاموں کو مجبوراً اپنے مالک
کی زبان سیکھنی پڑتی اور وہ مذہب اختیار کرنا
پڑتا جو مالک کا ہوتا۔

گی آنا اور جزائر غرب الہند میں اسلام:۔

اسلام جزائر غرب الہند، گی آنا اور دوسرے
جنوبی امریکہ میں کیسے پہنچا؟ اس سلسلہ میں ابھی
پوری تحقیق نہیں ہوئی۔ اور جو کام ہوا ہے وہ بھی
تک تشنۂ تکمیل ہے۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ نائیجیریا

(مغربی افریقہ) سے جب غلام دُنیا کے اِس حصّہ میں منتقل کیئے گئے تو اُن میں سے کئی مسلمان تھے۔ اگرچہ غلاموں کو مذہبی رسُوم ادا کرنے کی آزادی نہ تھی، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ عیسائی مذہب کے مطابق عبادات بجا لائیں لیکن پھر بھی بعض باہمّت افراد اِس قسم کی پابندیوں سے نفرت کرتے تھے۔ گی آنا میں قیام کے دَوران مجھے اکثر ایسی روایات سُننے کا اتفاق ہُوا ہے کہ مغربی افریقہ سے آنے والے بعض افراد چھُپ چھُپا کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ مالک اُن پر سختی کرتے اور اُنہیں عیسائیت کے مطابق عبادت کرنے پر مجبور کرتے لیکن وہ سختیاں برداشت کر جاتے اور نماز کی ادائیگی سے نہ رُکتے۔ ان سختیوں کی داستانیں سُن کر حضرت بلال رضؓ پر کی گئی سختیوں کے واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ان روایات پر یقین آجاتا ہے کہ حضرت بلال رضؓ کی قوم نے واقعی شدائد برداشت کئے ہوں گے لیکن اسلام سے وابستگی کو آسانی سے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ہوں گے۔

اِس بات کو کہ اسلام جزائر غرب الہند اور اس سے ملحقہ جنوبی امریکہ کے ممالک میں غلاموں کے ذریعہ پہنچا اِس امر سے تقویّت پہنچتی ہے کہ ان علاقوں میں اب تک "مسلمان" کو "فولامین" (FULAMA) کہا جاتا ہے۔ سیرالیون کے قیام کے دَوران "فولا" کے لفظ سے مَیں مانوس ہُوا تھا۔ مغربی افریقہ کے بعض علاقوں میں فولانی ایک مسلمان قبیلہ ہے جس کے افراد فولا کہلاتے ہیں۔ اور یہ لوگ فولا کہلانے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ یہ قبیلہ مسلمان ہے اس لئے دوسرے قبائل کے مسلمانوں کو بھی بعض ممالک میں اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گی آنا (سورینام) اور فرینچ گی آنا میں مسلمانوں کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ غلامی کے غیر قانونی قرار دیئے جانے کے بعد مذہبی رسومات وعبادات پر جو ظالمانہ پابندیاں مالکوں کی طرف سے عائد کی جاتی تھیں اُن کی زنجیریں بھی ڈھیلی پڑ گئیں اور جو افراد دل سے مسلمان تھے اور چھُپ چھُپا کر اللہ کو یاد کیا کرتے تھے برملا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے لگے۔

انڈونیشیا اور پھر برصغیر پاک و ہند سے مسلمانوں کی آمد:۔

غلامی کو غیر قانونی قرار دیئے جانے پر پلانٹرز (PLANTERS) کو اپنے وسیع و عریض فارموں پر کام کرنے والوں کی کمی محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ اب افریقنوں سے اس طرح کام نہیں لے سکتے تھے جس طرح کہ وہ غلامی کے دَور میں اُن سے لیتے رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے اُن کو نئی راہیں تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ پہلے پرتگال سے کچھ لوگ ایک معیّن مدّت تک کیلئے لائے جاتے۔ مگر یہاں کی آب و ہوا اُن کو موافق نہ آئی اس لیئے وہ زیادہ کامیاب مزارع ثابت نہ ہوئے۔ پھر چین

کی طرف رُخ کیا گیا مگر چینی بھی اِس کام کے لیئے کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ بالآخر پلانٹرز کی نظریں انڈیا اور انڈونیشیا کی طرف اُٹھیں۔ چونکہ گی آنا، انڈونیشیا اور انڈیا کے بعض علاقوں کی آب وہوا ایک جیسی تھی اِس لیئے اِن ممالک سے لوگوں کو ایک معیّن مدّت کے لیئے وہاں کام کرنے کے لیئے لے جانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ ان ہردو ممالک سے کھیتوں میں کام کرنے کے لیئے موزوں افراد کو پانچ سال کے عرصہ کے لیئے لے جایا جاتا۔ ان لوگوں کی زیادہ تعداد اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں وہاں منتقل کی گئی۔ ان لوگوں پر گی آنا میں کام کرنے کی پابندی پانچ سال کے لیئے ہوتی تھی۔ اور پانچ سال پُورے کرنے پر اُن کو اجازت ہوتی تھی کہ واپس اپنے اپنے وطنوں میں چلے جائیں یا وہیں پر مستقل سکونت اختیار کرلیں۔ اس طرح کچھ لوگ مدّتِ ملازمت پُوری کرنے کے بعد واپس لَوٹ جاتے اور کچھ وہاں ہی سکونت اختیار کر لیتے۔ چونکہ نوآبادیاتی نظام جوانی کے دن گزار کر بڑھاپے میں داخل ہورہا تھا اِس لیئے بھرتی کرکے لے جائے جانے والوں کے لیئے مذہبی امتیاز کی شرط ختم کردی گئی۔ لہذا ہندوستان اور انڈونیشیا سے مسلمان بھی اِن علاقوں میں پہنچ گئے اور ان میں سے بعض نے وہاں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی اور مستقل مسلمان آبادیاں وجود میں آگئیں۔ جہاں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں تھے یا اتنی تعداد میں کہ

ان کو عبادت اور دیگر مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیئے مساجد کی ضرورت محسوس ہو۔ سو وہاں پر مساجد تعمیر کرلی گئیں اور ساتھ ہی ایک آدھ کمرہ تعمیر کرلیا گیا جس میں بچّوں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت کو پُورا کیا جانے لگا۔

مساجد کے محراب مغرب کی جانب:

سورینام (سابقہ ڈچ گی آنا) میں انڈونیشیا سے جو لوگ کھیتوں پر کام کرنے کے لیئے لائے گئے ان کی اکثریت مسلمان تھی۔ سورینام پہنچ کر انہوں نے عبادات کے لیئے مساجد تعمیر کیں جن کا رُخ انڈونیشیا کی طرح مغرب کی طرف ہی رکھا۔ انڈونیشیا سے قبلہ مغرب کی جانب ہے لہذا مساجد کے محراب مغرب کی طرف ہونا ایک لازمی امر ہے۔ مگر باوجود اسکے کہ یہ لوگ اب قبلہ سے مشرق کی جانب نہیں بلکہ مغرب کی طرف بہت دُور نکل گئے تھے اور مکّہ شریف کو اپنے پیچھے جانب مشرق چھوڑ آئے تھے مگر وہاں پہنچ کر بھی وہ یہی سمجھے کہ قبلہ مغرب کی طرف ہے۔ چنانچہ بعض مساجد سورینام میں اب بھی ایسی ہیں جن کے محراب مغرب کی طرف ہیں۔ انڈونیشی مسلمانوں کی بعض جماعتوں نے اب اپنی مساجد کے محراب مشرق کی جانب بنانے شروع کیئے ہیں مگر اس سے اُن میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ بعض مقامی امام اب تک مُصر ہیں کہ محراب مغرب کی طرف ہی ہونے چاہئیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حقیقت کے خلاف

ہے۔ لہٰذا اب وہاں پر ان مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جو مسلمان برصغیر سے وہاں پہنچے انہوں نے اپنی مساجد کے محراب مشرق کی جانب بنائے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ نسبتاً دیر سے وہاں لے جائے گئے جبکہ قبلہ کے تعین کا طریق واضح ہو چکا تھا۔ بہرحال اس سے یہ واضح ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے وہاں ان پڑھ لوگ ہی لے جائے جاتے تھے تاکہ اُن سے سخت سے سخت کام لیا جا سکے۔

جنوبی امریکہ کے ان علاقوں میں کم و بیش پانچ سے دس فی صد تک مسلمان آباد ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمان آبادی میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے۔ افریقن آباد کار بھی اسلام کو قبول کر رہے ہیں۔ احمدیت کی تعلیم نے مسلمانوں کو دلائل کے جدید ہتھیار مہیا کر دیئے ہیں جن کے ذریعہ وہ نہ صرف اسلام پر حملوں کا بطریق احسن جواب دے سکتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ غیر مسلموں کو بھی مسلمان بنا رہے ہیں۔

گی آنا میں احمدیت:۔

گی آنا میں احمدیت کا تعارف کب اور کیسے ہوا؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں ٹرینیڈاڈ سورینام اور گی آنا تینوں کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے ان علاقوں میں احمدیت کا تعارف بذریعہ لٹریچر ہوا۔ لیکن کب ہوا، اس بارہ میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جن ابتدائی احمدیوں سے مجھے گی آنا میں قیام کے دوران ملنے کا اتفاق ہوا ہے اُن کی روایات میں بھی اختلاف ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان احمدیہ جماعت کی طرف سے شائع شدہ انگریزی لٹریچر کسی نہ کسی ذریعہ سے پہلے ٹرینیڈاڈ پہنچا اور وہاں چند لوگ احمدیت کی تعلیم سے متاثر ہوئے۔ پھر سورینام (ڈچ گی آنا) تک یہ اثر پہنچا وہاں پر بھی بعض لوگ اس پاک تعلیم سے جو اسلام کے چہرے کو صحیح رنگ میں پیش کرتی تھی متاثر ہوئے چونکہ سورینام اور گی آنا کی سرحدیں ملتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے ملک میں بلا روک ٹوک سفر کر سکتے ہیں اور ان کی آپس میں رشتہ داریاں بھی ہیں لہٰذا اس طرح گی آنا میں احمدیت کا پیغام پہنچا اور گی آنا کی چند تشنہ روحوں نے اس شربت وصل و بقا کے جرعات سے اپنی روح کو سیراب کیا اور یوں برصغیر کی آزادی کے جلد بعد گی آنا میں احمدیہ جماعت باقاعدہ قائم ہو گئی۔ سورینام، گی آنا اور ٹرینیڈاڈ سے تین طلبا مرکز میں تعلیم حاصل کرنے آئے۔

گی آنا کی جماعت نے مرکز سے مبلغ بھجوانے کی درخواست کی جس کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ نے ۱۹۶۰ء میں مکرم و محترم مولوی بشیر احمد صاحب آرچرڈ کو ٹرینیڈاڈ سے گی آنا بطور مبلغ بھجوا دیا۔ اور اس طرح گی آنا

مشن کا قیام عمل میں آیا۔ جو ابتدا ہی سے اللہ کے فضل سے مستعد و فعال طور پر مصروف عمل ہے۔

درِ خیر البشرؐ ہی منزلِ مقصود ہے اپنی

سدا گردوں پہ چمکے گا ستارہ احمدیّت کا
رہے گا ضوفشاں ہر دم منارہ احمدیّت کا

درِ خیر البشرؐ ہی منزلِ مقصود ہے اپنی
اُسی کا حُسن و احساں ہے سہارا احمدیّت کا

محمّدؐ ہے پتّے پتّے میں محمّدؐ ذرّے ذرّے میں
ذرا سوچو تو یہ جلوہ ہے سارا احمدیّت کا

حضورِ قادیانی ہیں غلامِ احمدِ عربی
اُسی کے فیض سے ہے نُور سارا احمدیّت کا

نشأۃِ ثانیہ کا دَور ہے یہ پندرھویں ہجری
بجے گا ایک عالم میں نقارہ احمدیّت کا

انہیں باطل کی چیرہ دستیاں مرغوب ہیں شاید
عروج ان کو نہیں ہرگز گوارا احمدیّت کا

خدا کا شُکر کرنے سے زباں قاصر قلم عاجز
کہ ہر اک کام ہے جس نے سنوارا احمدیّت کا

گرا یہ جس پہ وہ ٹوٹا، گرا جو اس پہ وہ ٹوٹا
یہ ایماں ہے یا کوئی سنگِ خارا احمدیّت کا

جدھر دیکھو جہاں میں شرک و بدعت کی وبائیں ہیں
مگر جنّت بداماں ہے نظارا احمدیّت کا

رہے دُنیا میں یارب اِک اماں اسلام کا پرچم
یہی تو اک نشاں ہے پیارا پیارا احمدیّت کا

اسی میں ہے نجاتِ اُخروی کا راز اے لوگو!
کبھی دامن نہ چھوڑو تم خدارا احمدیّت کا

نہیں نفرت کسی سے بس محبّت ہی محبّت ہے
محبّت ہی نے ہے چہرہ نکھارا احمدیّت کا

جسے بخشی گئی ہے اب خلافت بھی امامت بھی
اسی کو زیب دیتا ہے "ستارہ" احمدیّت کا

مری مرقد پہ آ کر لوگ یہ کہہ کر دُعا دیں گے
بہت دیوانہ تھا احسنؔ ہمارا احمدیّت کا

(احسن اسمٰعیل۔ گوجرہ)

فلسفۂ تاریخ کا بانی

ابنِ خلدون

(طارق احمد بٹ۔ کراچی)

"مغلوب قومیں ہمیشہ غالب اقوام کی تقلید کرتی ہیں۔ کیونکہ نفس انسانی کی یہ کمزوری ہے کہ جن لوگوں کی اطاعت و پیروی پر وہ مجبور ہوتا ہے۔ ان میں غیر شعوری طور پر ایک طرح کے کمال کو مانتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ وہ کمال اس میں منتقل ہو جائے۔ یا اس کو یہ غلط فہمی تقلید پر ابھارتی اور اکساتی ہے کہ ان قوموں کو ہم پر جو غلبہ و استیلاء حاصل ہوا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کے پیچھے کوئی قانون کارفرما ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ان کمالات سے متصف ہے۔ یہ غلط فہمی جب مذہب و اعتقاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر غالب اقوام کے تمام خیالات و افکار کو اپنانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔"

یہ الفاظ علامہ عبدالرحمن ابنِ خلدون کے ہیں۔ ابنِ خلدون ۲۷ مئی ۱۳۳۲ء مطابق یکم رمضان ۷۳۲ھ تیونس شمالی افریقہ میں پیدا ہوا اس کا تعلق اندلس (مسلم اسپین) کے ایک خاندان سے تھا جو کہ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں اسپین سے منتقل ہو کر تیونس آیا تھا — ابنِ خلدون اندلس کے ایک ممتاز اور با اثر خاندان کا فرد تھا۔ اس خاندان کے سربراہ خلدون فتح اندلس کے موقع پر یمنی دستوں کے ساتھ اس سرزمین پر آئے اور یہاں انہوں نے اپنے خاندان کی بنا ڈالی لیکن بنو خلدون کو عروج تیسری صدی ہجری کے آخر یعنی ۲۷۴ھ اور ۳۰۰ھ کے درمیان حاصل ہوا۔ یہ امیر عبداللہ ابن محمدؒ کا دورِ حکومت تھا جس کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ اس کے بعد وہاں حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں لیکن بنو خلدون کے لوگ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ابن خلدون کے والد محمدؒ کو سیاسی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ صرف علمی و

ادبی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔

خلدون دراصل خالد کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ خالد، خلدون کے عجیب وغریب قالب میں کیونکر ڈھلا۔ اس کی اہل علم نے دو توجیہات بیان کی ہیں:۔

۱۔ جو خاندان اندلس میں آباد ہو گئے تھے اُن کی یہ عادت تھی کہ اپنے سلسلۂ آباؤ اجداد میں سے نسبتاً کم معروف شخص کو چُن لیتے اور اُس کے آخر میں واؤ نون کا لاحقہ بڑھا دیتے تاکہ اُن میں اور یہاں کے اصلی خاندانوں میں ایک طرح کا امتیاز پیدا ہو جائے۔ جیسے حفصون، بدرون اور عبدون وغیرہ۔ اصل میں یہ حفص، بدر اور عبد تھے۔

۲۔ واؤ نون کا یہ اضافہ ہسپانوی زبان میں تکبیر و تعظیم کی غرض سے ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خلدون سے خالد اکبر، اور حفص، بدر اور عبد، علی الترتیب حفص اعظم، بدر اعظم اور عبد اعظم کے مترادف ہیں

ابن خلدون کے پہلے استاد اُس کے والد محمد ہی تھے۔ آغاز میں ابن خلدون نے قرآن پاک کو حفظ کیا اور فنِ قرأت کے مختلف اسلوب سیکھے۔ اس کے بعد حدیث اور مالکی فقہ کا مطالعہ کیا۔ قواعد اور صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۳۴۹ء میں طاعون کی وبا پھیلی جس نے سمرقند سے لے کر ماریطانیہ تک تمام اسلامی دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابن خلدون نے اس وبا کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے:۔

"اس وبا نے قالین کو مع اُن تمام چیزوں کے جو اس پر تھیں، لپیٹ دیا۔ یہاں تک کہ میرے والدین، اساتذہ اور بے شمار اہم شخصیتیں بھی!"

ابن خلدون اس سانحہ سے ازحد متاثر ہُوا اور سلسلۂ حصولِ تعلیم کو جاری نہ رکھ سکا۔ اور اُس نے ماریطانیہ کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اپنے سب سے بڑے بھائی کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد ابن خلدون کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہُوا جب محمد ابن تفرقین نے جو تیونس پر قابض تھا اُس کو نوجوان سلطان ابو اسحٰق کے مہر بردار (سیکرٹری) کے فرائض انجام دینے کے لیے طلب کیا۔ سلطان ابو اسحٰق اُس کے زیرِ حراست تھا۔ ابن خلدون کا کام یہ تھا کہ وہ سرکاری خط و کتابت اور قانونی فیصلوں اور احکامات پر سلطان کا نام اور مُہر ثبت کرے۔ ابن خلدون کو یہ فرض ۲۰ سال سے بھی کم عمر میں سونپا گیا۔

ساتویں صدی ہجری کا آخر تھا۔ شمالی افریقہ سازشوں، سیاسی دھڑے بندیوں اور افراتفری

کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انقلابات بہت تیزی سے رونما ہو رہے تھے ـــــ الموحدّث کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں ـــــ اسی دَور میں ابن خلدون نے صحیح معنوں میں اپنی "سیاسی زندگی" کا آغاز کیا۔

سلطان ابوعنان کے دربار میں جو اُس وقت شمالی افریقہ کی سب سے بڑی امارت کا سربراہ تھا۔ ابن خلدون دو سال تک اہم فرائض انجام دیتا رہا۔ سلطان اس پر نہایت مہربان تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ابن خلدون کو اپنا سیکرٹری بنا لیا۔ ابن خلدون اُس کی ذاتی مشاورتی کونسل کا ممبر اور اس کے بجائے دستخط کرنے کا مجاز بھی تھا ـــــ لیکن اس کے باوجود اس نے سلطان کے خلاف امیر ابن عبداللہ محمد کی سازش میں سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیا۔ اس جرم میں اس کو دو سال قید میں گزارنے پڑے۔

ابن خلدون نے اپنے ان اقدامات کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی دلائل پیش کر کے ان اقدامات کو بہتر اور صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ـــــ اُس وقت اُس کی عمر بائیس سال تھی، لیکن اس کی علمیت، دانشمندی، دُور بینی، قوّتِ ارادی، کردار کی مضبوطی، قوّتِ فیصلہ اور ایک معزز اور بڑے خاندان سے تعلق کی بنا پر ہمیشہ اس کو بہتر مواقع حاصل ہوتے رہے اور وہ شمالی افریقہ کی مختلف ریاستوں میں اہم فرائض انجام دیتا رہا۔ اس لئے شمالی افریقہ کی حکومتوں کی تاریخ میں اسے نہایت اہم حیثیّت حاصل ہے ـــــ اس کی یہ حیثیت ایک مؤرّخ اور مفکّر کی حیثیت کے علاوہ ہے۔

ابن خلدون کچھ عرصہ بعد سیاسی سرگرمیوں سے کسی حد تک اُکتا گیا اور اُس نے درخواست کر کے "بنو عارف" کے محلات میں سے ایک محل جس کا نام "سلامہ" تھا، حاصل کر لیا۔ اُس نے اس ویران مگر پُرسکون جگہ چار سال گزارے ـــــ زندگی میں پہلی بار ابن خلدون کو سیاسی جوڑ توڑ، درباری سازشوں، سفر کی صعوبتوں اور فوجی شورشوں سے چھٹکارہ نصیب ہوا۔ اُس کی عمر پینتالیس سال ہو چکی تھی۔ اُس کے افکار و نظریات میں پختگی آ چکی تھی اور وہ وقت آ پہنچا تھا جب کہ وہ سکون کے ساتھ علمی سرگرمیاں شروع کر سکے۔ یہاں اُس نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو اسلامی دُنیا میں اُس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ـــــ یعنی اس کی تاریخی تحقیق و ترتیب۔

۱۳۷۷ء مطابق ۷۷۹ھ میں ابن خلدون نے اسی "قلعۂ سلامہ" میں اپنی تاریخ کا مشہور زمانہ "مقدمہ" تحریر کیا۔ یہ مقدمہ ابن خلدون نے پانچ ماہ میں مکمل کیا۔ مقدمہ کی تکمیل کے بعد اُس نے تاریخ لکھنی شروع کی۔ ابن خلدون کا مقصد نوعِ انسانی کی کوئی عام تاریخ مرتّب کرنا نہیں تھا بلکہ وہ عرب، شمالی افریقہ و بربر ریاستوں اور زناطہ قبائل کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا ـــــ لیکن جلد ہی اُس نے اپنے نقطۂ نظر میں ترمیم کی اور فیصلہ کیا کہ وہ

نوعِ انسانی کی تاریخ لکھے گا۔

قلعہ سلامہ جیسی ویران جگہ مطالعہ اور ریفرنس کے لئے کتب کی سخت قلت تھی۔ ان کے بغیر ابن خلدون کے مشن کی تکمیل ناممکن تھی۔ بہرحال اُس نے مقدمہ کے بعد عرب اور بربر قوم کی تاریخ مکمل کر لی اور ۱۳۷۸ء میں اپنے وطن تیونس جانے کا ارادہ کیا جہاں بہت سے بڑے بڑے اور عظیم کتب خانے اور علمی مراکز موجود تھے۔ تیونس کا حکمران سلطان ابو العباس، پُرانی رنجش کی وجہ سے ابن خلدون سے ناراض تھا ــــ چنانچہ ابن خلدون نے تحریری طور پر سلطان سے معافی طلب کی۔ سلطان نے اسے معاف کر دیا ــــ رجب ۷۸۰ھ میں ابن خلدون نے بنو عارفہ کو خیر باد کہا۔ صحرا پار کیا اور ۷۵۲ھ کے بعد سے جبکہ وہ بیس سال کا ایک نوجوان تھا، اب پہلی بار اپنے وطن تیونس میں وارد ہوا۔

ابن خلدون سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے ایک بار پھر اسے گلے لگا لیا اور اس کی ہمت افزائی کی اور کہا کہ وہ جلد از جلد اپنے کام کو مکمل کرے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ابن خلدون نے محسوس کیا کہ تیونس میں اس کی واپسی اور سلطان کی مہربانیوں کے سبب چند لوگ اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں میں سرِفہرست اس کا پرانا رقیب الفقیہہ (مفتی اعظم) "ابنِ عرفہ" تھا ــــ ابن خلدون اس دشمنی کی وجہ یہ بیان کرتا ہے:۔

"علمی و ادبی حلقوں میں اسے ابن عرفہ پر فوقیت حاصل تھی۔ طلباء کی اکثریت ابن عرفہ کے بجائے اس سے درس لینا پسند کرتی تھی۔ اس کے علاوہ عدالتوں کے افسران بھی ابن خلدون سے تعلقات رکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔"

بہرحال ابن خلدون کی حیثیت اس قدر مستحکم تھی کہ وقتی طور پر تو یہ سازشیں بے اثر ہی ثابت ہوئیں۔

ابن خلدون نے جب ضروری مواد حاصل کر لیا تو عملی طور پہ تحریر کی ابتداء کی اور ۱۳۸۲ء مطابق ۷۸۴ھ میں اپنی تاریخ کا حصہ اوّل مکمل کر کے سلطان ابو العباس کی خدمت میں پیش کیا ــــ یہ حصہ مقدمہ بربر اور زناطہ قبائل کی تاریخ، اسلام سے قبل اور ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کی تاریخ اور دیگر مفتوحہ اسلامی ریاستوں کی تاریخ پر مشتمل تھا۔ بعد میں اس حصہ میں مزید ترمیم کی گئی۔ یعنی اسلامی مفتوحات کے بارے میں تفصیلی جائزہ۔ ابتدائی قوموں اور عیسائیوں کا تذکرہ وغیرہ ــــ جس روز ابن خلدون نے سلطان کو اپنی تاریخ کا یہ حصہ پیش کیا تو اسکے ساتھ سَو اشعار پر مشتمل سلطان کی شان میں ایک قصیدہ بھی بھرے دربار میں پڑھا۔

امن و امان اور سکون کا یہ دور ابن خلدون کے لئے جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے خلاف ابن عرفہ اور اس کے ساتھیوں کی سازشیں عروج کو پہنچ رہی تھیں۔ ابن خلدون خود کو سیاسی اور سرکاری کاموں سے علیحدہ رکھنا چاہتا تھا لیکن بہر حال سلطان کے مجبور کرنے کے سبب وہ بددلی کے ساتھ درباری مصروفیات میں شامل رہتا تھا — ایک بار سلطان ایک سفر کی تیاری میں تھا۔ ابن خلدون نے محسوس کر لیا کہ وہ لازماً اسے ساتھ چلنے کو کہے گا۔ اس لیئے اس نے بطور بہانہ سلطان سے حج پر جانے کی اجازت چاہی۔ سلطان نے اسے اجازت دے دی اور ابن خلدون نے اپنی جائے پیدائش کو ہمیشہ کے لیئے خیر باد کہہ دیا — اس طرح شمالی افریقہ میں اسکی زندگی کا سنہرا دور ختم ہو گیا۔

ابن خلدون اکتوبر ۱۳۸۲ء میں ایک صبر آزما اور تکلیف دہ بحری سفر کے بعد اسکندریہ کی بندرگاہ پر اُترا۔ خود اس کا کہنا ہے کہ وہ حاجیوں کے ایک قافلہ میں شریک ہونے کے لیئے مصر گیا تھا۔

جب وہ مصر پہنچا تو اس کی عمر باون سال تھی لیکن اس کے باوجود اس میں کام کرنے کا جذبہ اور ہمت پوری طرح موجود تھی — اُن دنوں قاہرہ مشرق و مغرب میں اسلامی تعلیمات کا مرکز تھا۔ اور مصری حکومت علم و ادب کی سرپرستی کے لئے کافی مشہور تھی — ابن خلدون بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ یہ سرپرستی اسے بھی حاصل ہو سکے گی۔ چنانچہ وہ نومبر ۱۳۸۲ء میں قاہرہ پہنچا اور اس شہر کی وسعت، جدت اور خوبصورتی کو دیکھ کر اتنا ہی متاثر ہوا جتنا اس کا ہم وطن سیاح ابن بطوطہ متاثر ہوا تھا — یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس لئے کہ اب تک اس نے صرف شمالی افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا دیکھے تھے۔

ابن خلدون مصر کے لوگوں خصوصاً قاہرہ کے علمی و ادبی حلقوں کے لیئے قطعی اجنبی نہ تھا۔ اپنی تصنیف اور مقدمہ کے باعث وہ یہاں بے حد مقبول تھا۔ چنانچہ اس کے قاہرہ پہنچتے ہی دُور دُور سے علماء اور طلبہ دونوں ہی اس سے ملنے کیلئے آنے لگے۔ ابن خلدون نے جلد ہی وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا — "الازہر" میں ابن خلدون نے حدیث و فقہ (مالکی مکتبہ فکر) کے علاوہ بہت سے سماجی اور معاشرتی نظریات کے بارے میں لیکچر دیئے۔ یہ لیکچر اس کی بے پناہ علمیت، گہرے مطالعہ اور دلنشیں اندازِ بیان کا بہترین نمونہ تھے — ایک مصری اسکالر کے مطابق :-

"ابن خلدون استدلال کا بادشاہ تھا"

ابن خلدون نے مصری معاشرے میں بہت جلد ایک اہم مقام حاصل کر لیا اور مصری دربار کے ایک امیر کے توسط سے اس کی پہنچ سلطان الظاہر برقوق تک ہو گئی۔ سلطان نے اسکی معقول

تنخواہ مقرر کردی اور دیگر تمام مراعات بھی فراہم کردیں۔ جلد ہی ابن خلدون کو مالکی مکتبۂ فکر سے متعلق ایک مدرسہ میں پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔
—— اس کے بعد ۱۳۸۴ء میں اسے جمال الدین ابن خیر السکندری کی جگہ مالکی قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ ابن خلدون کیلئے بلاشبہ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس سے ابن خلدون کی علمی قابلیت اور فقہ پر عبور کا پتہ چلتا ہے کہ ایک غیر مصری ہونے کے باوجود سلطان نے اس کو اتنے اہم عہدہ پر فائز کیا۔

کچھ عرصہ بعد ابن خلدون کی شدید مخالفت شروع ہوگئی اور ان حالات میں اس کے تعلقات سلطان سے پہلے جیسے نہ رہے —— اسی دوران ابن خلدون نے اپنے خاندان کے بیشتر لوگوں کو تیونس سے مصر بلانا چاہا لیکن تیونس کے سلطان نے ان پر پابندی عائد کردی۔ سلطان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح ابن خلدون تیونس واپس آجائے گا۔ ابن خلدون نے مصر کے سلطان الظاہر سے درخواست کی کہ وہ اِس سلسلے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے۔ چنانچہ اس کی درخواست پر ابن خلدون کے بیوی بچوں کو تیونس چھوڑنے کی اجازت مل گئی اور وہ لوگ ایک جہاز میں سوار ہو کر مصر کی جانب روانہ ہو گئے لیکن راستہ میں جہاز ایک طوفان کی زد میں آگیا۔ اور ابن خلدون کا خاندان موت کی نذر ہو گیا۔ یہ سانحہ ابن خلدون کے لیے شدید صدمہ کا باعث بنا اور وہ اپنی زندگی سے اُکتا سا گیا اُس نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن اس سے قبل ہی اس کو اس عہدہ سے برطرف کر دیا گیا —— ابن خلدون کا کہنا ہے کہ بات اس کی خواہش کے مطابق تھی۔ وہ مجموعی طور پر ایک سال اس عہدہ پر فائز رہا۔

برطرفی کے بعد اُس نے علمی مشاغل کو دوبارہ اپنا لیا۔ سلطان کی مہربانیاں کسی حد تک اب بھی اس کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ اسے مالکی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے ایک ادارے "برقوقیہ اسکول" میں استاد مقرر کر دیا گیا کچھ عرصہ بعد ابن خلدون نے امام مالکؒ کی کتاب "الموطا" کو نصابی کتاب قرار دے دیا —— ۷۹۱ھ میں مصر میں سازشوں کے بعد مسلسل دو انقلاب آئے اور سلطان الظاہر برقوق کو گرفتار کر لیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اُس نے قید سے فرار ہو کر دوبارہ اپنی سلطنت حاصل کرلی۔ اس دوران ابن خلدون کو کافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا —— تقریباً چودہ سال بعد جب اُس وقت کے مالکی چیف جسٹس کا انتقال ہوا تو سلطان نے دوبارہ ابن خلدون کو اسی عہدہ پر بحال کر دیا۔

سلطان الظاہر برقوق کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا الناصر تخت نشین ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے —— ابن خلدون اس قسم کے حالات اور ہنگاموں سے

سخت نالاں تھا۔ وہ الناصر سے اجازت لے کر یروشلم روانہ ہوگیا۔ وہاں اس نے مسجد اقصیٰ اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی ——— رمضان ۸۰۲ھ میں وہ قاہرہ واپس پہنچ گیا۔

ابن خلدون کو ۸۰۳ھ میں دوبارہ چیف جسٹس کے عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ چند ہی دن بعد تاتاری شہنشاہ تیمور نے شام پر چڑھائی کر دی اور وہاں کے حالات ایک بار پھر بُری طرح بگڑ گئے۔

کچھ عرصہ بعد ابن خلدون کی ذاتی کوششوں سے اُسے دوبارہ چیف جسٹس کا عہدہ مل گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر ۷۴ سال تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُس میں کام کرنے کا حوصلہ تھا اور وہ اُس وقت بھی نہایت ہشاش بشاش اور پُر مسرت تھا۔

ابن خلدون کو یکے بعد دیگرے کئی دفعہ چیف جسٹس کے عہدہ سے برطرف کیا گیا اور پھر دوبارہ رکھا گیا۔ اِس سلسلے میں ابن خلدون کہتا ہے :-

"حکومت کو اِس منصب کے لیئے مناسب ترین شخص وہی معلوم ہوتا تھا اور حکومت مجبور ہو جاتی تھی کہ اسے یہ ذمّہ داری سونپے"

مختصر یہ کہ مجموعی طور پر ابن خلدون چھ مرتبہ اس عہدہ پر فائز ہوا ——— آخری بار شعبان ۸۰۸ھ میں اُس نے یہ ذمّہ داری قبول کی۔ لیکن چند ہی ہفتے بعد یعنی ۲۶ رمضان ۸۰۸ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۴۰۶ء میں یہ عظیم مؤرخ و مفکّر اور مالکی چیف جسٹس شاندار مگر ہنگامہ خیز زندگی گزارنے کے بعد ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کر گیا اور آنے والی نسلوں کے لیئے ورثہ کے طور پر بالکل منفرد اور اچھوتے افکار چھوڑ گیا۔

ابن خلدون نے مصر میں ۲۳ سال گزارے اور وہیں "باب النصر" میں مدفون ہوا ——— یہ قبرستان صرف علماء اور ممتاز ترین شخصیتوں کے لیئے مخصوص تھا ——— وہ ماہِ رمضان میں پیدا ہوا اور اسی ماہ میں اس کا انتقال ہوا۔

علاوہ تاریخ کے ابن خلدون کی حسب ذیل تصنیفات بھی بہت مشہور ہیں۔ ان تصنیفات کا لسان الدین الخطیب نے اپنی کتاب "الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ" میں نہایت اچھے انداز میں ذکر کیا ہے ——— (۱) شرح قصیدہ بردہ۔ (۲) المحصل کی تلخیص۔ (۳) ابن الخطیب کے ایک ارجوزہ کی شرح۔ (۴) ابن رُشد کے بعض رسائل کی تلخیص۔ (۵) منطق پر ایک رسالہ۔ (۶) ریاضی پر ایک کتابچہ۔ اِس کے علاوہ شعر و سخن کا ذخیرہ بھی اس سے منقول ہے

ابن خلدون کی ہنگامہ خیز اور متحرک زندگی پر بعض اعتراضات بھی کیئے گئے ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ ہے کہ اس میں وفا شعاری اور ذمّہ داری کی سخت کمی ہے اور اس کا اخلاقی و دینی تصوّر اس قدر سمٹا ہوا اور محدود تھا کہ اس

میں دوستوں سے اخلاص، ممدوحوں اور کرم فرماؤں سے محبت و وفا اور اہلِ اسلام کی خیرسگالی و بہبود ایسے لطیف جذبات کے لیے گنجائش نہ تھی ــــ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی محبّت و وابستگی اور مدح وستائش کے محور، زمانہ کی ہر ہر جنبش کے ساتھ برابر بدلتے رہتے ہیں ــــ یعنی آج اگر اس کے مراسم ابو اسحٰق الحفصی اور الحسن بن عمر کے ساتھ ہیں تو کل ان کا حریف و دشمن اُس کا محبوب وممدوح ہے ــــ وفاداری کی یہی اُس میں اس حد تک ہے کہ اُس کے سامنے دمشق کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی ہے اور اہلِ شہر اور شرفاء ذلیل و رسوا اور قتل ہوتے ہیں اور اہلِ اسلام کی عزّت و آبرو سے ظالم تیمور کی فوجیں بے رحمانہ کھیلتی ہیں، لیکن یہ ٹس سے مَس نہیں ہوتا اور ایک حرفِ احتجاج مُنہ پر نہیں لاتا۔

دراصل ابن خلدون جس دَور میں پیدا ہوا اور جس انحطاط پذیر معاشرہ میں اُس نے آنکھیں کھولیں اور تربیت حاصل کی وہ وہ دَور ہے جبکہ پوری دُنیائے اسلام میں کوئی مضبوط اور باقاعدہ حکومت موجود نہیں تھی۔ عمومی تعلیم اور منشر کہ اخلاقی و دینی اقدار کی اشاعت و تبلیغ کا کہیں اہتمام نہیں تھا۔ جس سے کہ قوموں میں اخلاقی تصورات اُبھرتے ہیں ــــ بلکہ افراتفری کا یہ عالم تھا کہ ہر جگہ الگ الگ خلیفۃ المومنین اور منبر تھے۔ دولت و ثروت وزراء اور سلاطین کے عشرت کدوں میں سمٹ آئی تھی اور ترقی و اقبال کے تمام دروازے عوام پر بند تھے۔

اِن حالات میں ظاہر ہے ابن خلدون جیسا فاضل انسان بھی اپنے آپ کو انہی وزراء اور امراء کے ساتھ وابستہ رکھنے پر مجبور ہے خواہ وہ فراغت ویکسوئی سے اور بغیر کسی روک ٹوک کے کوئی علمی نوعیّت کا بڑا کام ہی کیوں نہ کرنا چاہتا ہو تاہم اس سے اُسے دماغی سکون میسّر آجاتا جس کی اُسے ہر دم ضرورت رہتی تھی۔

یہ درست ہے کہ نفسِ تاریخ نگاری میں ابن خلدون، بخاری، مسعودی، طبری اور ابن اثیر وغیرہ سے کچھ اونچا نظر نہیں آتا۔ تاہم ناانصافی ہوگی اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ اس میں بھی اس کی کچھ اہم خصوصیات ہیں جو کو دوسرے مؤرخین سے جُدا کرتی ہیں۔ اسکی تاریخ نگاری کی تین نمایاں خصوصیات ہیں:۔

پہلی خصوصیّت یہ ہے کہ اس نے قدماء کی طرح واقعات کو بترتیب سنین بیان نہیں کیا بلکہ اُس روش کو اُس نے چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ اس کا واقعات کو بیان کرنے کا عام انداز یہ ہے کہ ہر ہر حکومت اور معاشرہ کا یہ الگ الگ ذکر کرتا ہے اور اُس میں جو جو تبدیلیاں ہوئیں صرف اُنہی کو معرضِ تحریر میں لاتا ہے دوسری حکومتوں سے تعرض نہیں کرتا ــــ لیکن یہ خصوصیّت باعتبار اکثریت کے ہے۔ کیونکہ جہاں تک ترکِ سنین کا تعلق ہے اس میں یہ تنہا نہیں ہے مسعودی اس سے چار سَو سال پہلے گزرا ہے۔

اور اُس نے "مروج الذہب" میں بالکل یہی انداز اختیار کیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے اقوامِ بربر و ابن احمر کا حال جس تفصیل سے لکھا ہے اور بلادِ مغرب کی حکومتوں کا نقشہ جس ژرف نگاری سے کھینچا ہے یہ آج بھی ایسا ہے کہ اس کی افادیت ضائع نہیں ہوئی اور تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے قطع نظر کر کے سچا مؤرخ نہیں ہو سکتا۔ اِن اقوام و قبائل کے حالات بیان کرنے میں ابن خلدون اِس لیئے زیادہ بھروسے کے لائق ہے کہ ان میں یہ خود بھی شریک رہا ہے۔

تیسری خصوصیت اس کی کشادہ دلی اور بے تعصبی ہے۔ اور اس کا تعلق اُس کے مخصوص اسلوبِ فکر سے ہے جو صرف اسلامی تعلیمات سے پیدا ہوتا اور اُبھرتا ہے ـــــ ابن خلدون جب سپین کے عیسائیوں کے واقعات بیان کرتا ہے تو اس میں اپنی مؤرخانہ روش کو تنگ نظری سے ہرگز ملوث نہیں ہونے دیتا۔ اِس کا اندازہ کرنا ہو تو قرونِ وسطیٰ کے عیسائی مؤرخوں کی لکھی ہوئی تاریخوں پر نظر ڈالیئے۔ انہوں نے جب صلیبی لڑائیوں کے بعد اسلامی تاریخ نگاری پر توجہ فرمائی تو کتنا زہر اُگلا۔ کس درجہ غلط بیانیوں سے کام لیا اور حقائق کو کس درجہ بگاڑنے کی مذموم کوششیں کیں۔

اور ایک نمایاں امتیاز اس کی معلومات کی ہمہ گیری اور وسعت ہے۔ ایشیا کے علاوہ معلوم ہوتا ہے یہ یورپ سے بھی کسی قدر واقف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، ناروے اور ڈنمارک ایسے ممالک بھی اُس کے لیئے اجنبی نہیں ہیں۔ اور تو اور اُس وقت کے مغربی ممالک کے ملوک و سلاطین سے بھی یہ شناسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایڈورڈ سوئم کا ذکر اس کی تحریروں میں ملتا ہے۔

معلومات کی ہمہ گیری ہی اس کی وہ خصوصیت ہے جس نے اُس کو عام تاریخ نگاروں کی صف سے نکال کر عالمی سطح کے مؤرخین کے زمرہ میں لا کھڑا کیا ہے ـــــ فلسفۂ تاریخ میں اُس کا کیا مرتبہ و مقام ہے عصرِ حاضر کے عالمی مؤرخ ٹائن بی کہتے ہیں :-

> "جہاں تک اِس علم کا تعلق ہے عربی لٹریچر ایک ہی آدمی کے نام سے روشن ہے اور وہ ہے ابن خلدون۔ عیسائی دُنیا اِس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ حتّٰی کہ افلاطون، ارسطو اور اگسٹن بھی اِس خصوصیت میں اُس کے ہم پایہ نہ تھے۔"
>
> (اسٹڈی آف ہسٹری جلد سوم)

ابن خلدون دیگر تمام اسلامی مؤرخوں، خصوصاً اپنے سے قبل کے مؤرخوں سے بالکل ممتاز اور منفرد ہے۔ اُس نے تاریخ دانی کو ایک نیا آہنگ دیا۔ اسے صرف قصہ کہانی نہیں بلکہ ایک سائنسی مطالعہ کی حیثیت سے پیش کیا ـــــ تاریخ مرتب کرتے وقت بھی ابن خلدون نے وضاحت و

استدلال کا ایک ایسا طرز اختیار کیا جس سے ایک نئے علم "سوشل فلاسفی" کی بنیاد پڑی۔ ابن خلدون ایک جگہ کہتا ہے:-

"ماضی مستقبل سے اسی طرح مشابہ ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دوسرے قطرہ سے۔"

ابن خلدون نے اپنی تاریخ سے قبل جو "مقدمہ" تحریر کیا اس میں ایک طالب علم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ:-

"تاریخ کو کس انداز میں پڑھا جائے اور سمجھا جائے، کس طرح اس کو ایک نقاد کی نظر سے دیکھا جائے اور کس طرح اس کا بھرپور تجزیہ کیا جائے۔"

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابن خلدون اس علم کا موجد ہے۔ کیونکہ اس سے قبل کسی نے یہ بات اس انداز میں بتانے کی کوشش نہیں کی — خود ابن خلدون کہتا ہے:-

"یہ ایک نیا علم ہے جو اس پر نازل ہوا ہے۔"

یہ وہی علم ہے جسے ہم عمرانیات (سوشیالوجی) کہتے ہیں اور ابن خلدون اس علم کو "العمران اوالاجتماع البشری" کہتا ہے۔ یہ علم انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ تاریخ پڑھ کر وہ یہ سمجھ سکے کہ کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ تھا، کیا ممکن تھا اور کیا ناممکن تھا — یہ علم منطقی نقطۂ نظر سے شرح اس کے مسائل اور اس کی جزئیات کا مطالعہ کرنا سکھاتا ہے — ابن خلدون کہتا ہے:-

"قومیں مختلف سیاسی کروٹیں بدلتی رہتی ہیں اور ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہتیں۔ ان کے مزاج، عوائد اور رسمیات ان تبدیلیوں سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ گویا بالکل ایک نئی قوم معرض وجود میں آگئی ہے۔"

ابن خلدون نے اپنی کتاب میں محض تاریخ لکھنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ قوموں کے عروج و زوال اور اجتماعی حوادثات و نقصانات کے پیچھے جو اصول کارفرما ہوتے ہیں، ان کا کھوج بھی لگایا اور تاریخ اجتماع و عمرانیات کا ایک مکمل فلسفہ پیش کیا — اور اس میں شک نہیں کہ ابن خلدون کی نظر اجتماع و تمدن اور اقتصاد و معیشت پر بڑی گہری تھی۔

ابن خلدون ایک جگہ کہتا ہے:-

"یہ لوگ انسانی حالات سے تو ناواقف بہرحال ہیں۔ لیکن کیا ان کو معلوم نہیں کہ کواکب کے بارے میں ان کا علم اور بھی سطحی ہے۔ یہ غلط فہمی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ شاید کرۂ نار فی ذاتہٖ کرۂ نار

ہے اور آگ کا ایک دہکتا ہوا گولہ ہے۔ جتنا اس کے قریب ہوں گے اتنی ہی زیادہ تپش محسوس کریں گے ـــــ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج کی شعاعوں میں جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ اُس وقت اُبھرتی ہے جب وہ سطح ارضی سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہیں۔ لہذا اگر آپ ایسی جگہ چلے جائیں جہاں ٹکراؤ اور انعکاس قریب نہیں ہے تو بجائے گرمی کے وہاں سردی محسوس ہونے لگے گی"۔

بلاشبہ ابن خلدون ہمیشہ زندہ رہے گا اور لوگ صدیوں تک اُس کے افکار و علوم سے اپنی راہوں کو سنوارتے رہیں گے!

محترمہ عائشہ بی بی صاحبہ اہلیہ مکرم مرزا احمد الدین صاحب صدر جماعت احمدیہ چک ۵ ایم بی بعمر ۷۰ سال وفات پاگئیں

قارئینِ خالد کو یہ انتہائی افسوسناک خبر دی جاتی ہے کہ محترمہ عائشہ بی بی صاحبہ اہلیہ مکرم مرزا احمد الدین صاحب ۱۵؍اگست ۱۹۸۳ء کو ایک لمبی اور تکلیف دہ بیماری کے بعد وفات پاگئیں
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مرحومہ مکرم و محترم مرزا محمد الدین صاحب ناز "مدیر خالد" کی والدہ ماجدہ تھیں اور ایک نہایت مخلص، عبادتگذار، صابر و شاکر خاتون تھیں۔ مالی تحریکات میں ہمیشہ جوش و جذبہ سے حصّہ لیتی تھیں۔ مقامی لجنہ کی مثالی کارکن تھیں۔ بچّوں کی تربیت میں ہمیشہ خصوصی سعی فرماتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے دو بچے محترم مرزا محمد الدین صاحب نازؔ اور محترم مرزا محمد یوسف صاحب نیّر واقفِ زندگی ہیں اور دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔

آپ ۱۹۴۲ء میں اپنے شوہر کے قبولِ احمدیت کے صرف ۸ روز بعد' اُن کے اندر ایک نمایاں روحانی تبدیلی کا مشاہدہ کرکے' از خود بیعت کرکے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوگئیں۔ مرحومہ موصیہ تھیں۔ ایک سال سے انتڑیوں کی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ جلسہ سالانہ ۱۹۸۲ء سے قبل محترم ڈاکٹر ولی محمد صاحب نے اپریشن بھی کیا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا اور بیماری زور پکڑتی چلی گئی۔ اور آخر اپنے مولا کے بُلاوا پر جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

۱۶؍اگست کو نمازِ فجر کے بعد سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ الودود نے از راہِ شفقت نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بعد ازاں بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہونے پر محترم صدر صاحب مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ نے دُعا کروائی۔

احباب کرام کی خدمت میں درخواست ہے کہ دُعا کریں مولا کریم مرحومہ کو اپنے قُربِ خاص سے نوازے، درجات بلند فرمائے اور اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین ؂

ادب سے انتخاب

جب ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل پرائز ملا

"...... میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مہمان سویڈ گویا ہوئی۔" ابھی پچھلے سال ہم نے THEORATICAL PHYSICS کے لیئے تمہارے سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کو انعام دیا۔ وہ جب انعام لینے آیا، تو اُس نے عجیب و غریب لباس پہن رکھا تھا اور ساتھ اُس کا تین چار سال کا پوتا تھا جو ہال میں روتا رہا۔ اور پھر ڈاکٹر موصوف نے اپنی UNI-FICATION کی تھیوری کو خدا کی وحدت سے تعبیر کیا۔ بھلا سائنس میں خدا کہاں سے آگیا؟"

اب ایک اور نکتہ مجھے مل گیا تھا میں نے کہا "ڈاکٹر عبدالسلام کا نوبیل پرائز حاصل کرنا ہمارے لیئے فخر کی بات ہے اور اسی طرح فخر کی بات ہمارے لیئے یہ ہے کہ وہ اچکن، پگڑی اور کھُسّہ پہن کر انعام لینے آئے۔ یہ اس کا نیشنل پرائڈ ظاہر کرتا ہے۔ رہا پوتے کو ساتھ لانے کا مسئلہ تو وہ اُس کے چوائس کا مسئلہ ہے۔ اور رہا پوتے کے رونے کا مسئلہ تو وہ پوتے کے چوائس کا مسئلہ ہے! ـــــ لیکن جہاں تک خدا کی وحدت اور ڈاکٹر عبدالسلام کی UNIFICATION - THEORY کا تعلق ہے تو سائنسدان کے لیئے خدا کی نفی ضروری تو نہیں۔ آئن سٹائن ایک انتہائی مذہبی شخص تھا۔ ممکن ہے مذہب اور سائنس ایک نقطہ پر اتصال کر جاتے ہوں۔ لیکن ایک بات واضح کر دوں کہ ڈاکٹر سلام مذہب اسلام کی جدید تعبیر پر زور دیتا ہے اور مُلّا ازم پاپائیت اور مذہبی جنون کو انسانی ترقی و بہبود کے لیئے زہر قاتل جانتا ہے۔"

مہمان خاتون مسکرائی اور کہنے لگی "تم پاکستانیوں نے اپنے NOBEL LEUREATE کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کتنی ناخوشگوار بات تھی۔ سویڈن میں رہنے والے پاکستانی دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک نے کہا کہ ڈاکٹر سلام کو زبردست استقبالیہ دیا جائے۔ دوسرا گروپ جو مذہبی جنونیوں پر مشتمل تھا، نے موقف اختیار کیا کہ ڈاکٹر سلام غیر مسلم ہے، اُس کے فرقے کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ اُسے کوئی استقبالیہ نہ دیا جائے ـــــ ڈاکٹر سلام انتہائی کرب کے عالم میں سویڈن سے رخصت ہوا۔

ہم نے اُسے آنر کیا اور تم لوگوں نے اسے بے عزت کیا۔ یہ ساری کہانی سویڈش اخباروں نے چھاپی"۔

اب تینوں سویڈ طنزیہ مسکرا رہے تھے۔ اور مَیں اب میری باری اضطراری کیفیت میں مبتلا ہونے کی تھی۔ بات سچ تھی اور میرے پاس ہموطنوں کے قابلِ شرم سلوک کے لئے کوئی وضاحت نہیں تھی۔ مَیں نے جھٹ پینترا بدلا اور کہا "ایسا ہوا ہو گا لیکن مَیں اِس کے لئے کوئی معذرت نہیں کروں گا۔ نہ کوئی وضاحت کرونگا آپ غالباً یہ سب کچھ بڑھا چڑھا کے بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ آپ کو ایک پسماندہ ملک کے سائنسدان کا انعام حاصل کرنا پسند نہیں لیکن آپ کے پاس کوئی اور چوائس نہیں تھا۔ درحقیقت ڈاکٹر سلام کو بہت پہلے انعام ملنا چاہیئے تھا لیکن آپ نے جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ آپ نوبل پرائز دینے کے سلسلے میں کرتے ہیں"۔

مہمان سویڈ نے میری بات کاٹ دی۔
"اب چیزوں کو ریشنلائز مت کرو۔ یہ ڈیفنس میکانزم ہے۔ اِس طرح تم ہم وطنوں کے ناروا سلوک کا جواز پیش نہیں کر سکتے"۔ ....

(بشکریہ ماہنامہ تخلیق لاہور
جلد ۱۳، شمارہ ۹-۱۰ سنہ ۱۹۸۲ء)

مقدّس حُسن

جمعۃ الوداع کا ایمان افروز خطبہ سُننے اور نماز پڑھنے کے دَوران جو رقت انگیز نظارہ دیکھنے میں آیا اس کے نتیجہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے لیئے چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں کی یہ نظم جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن گئی —— (حیدر قریشی)

مَیں اب تک یہ سمجھتا تھا
"لب و رخسار کی سُرخی یہ
میری شاعری کے سب دمکتے رنگ بکھرے ہیں
طلسمِ حرف کے سب اسم بھی
اُسی آنکھ کے جادو میں بستے ہیں
مَیں جس کے حُسن میں اپنے معانی کھو جاتا ہوں
اور جسے پانے کی خواہش صرف خواہش ہی نہیں
اپنے ادھورے پن کی بھی تکمیل ہے"
مَیں اب تلک یونہی سمجھتا تھا
مَیں اب تک اپنے مفہوم و معانی ڈھونڈتا پھرتا،
مگر اِک برگزیدہ و مقدس، پاک اور طاہر
کہ جس کے رُوئے انور پر
کچھ ایسا حُسن، ایسا نور ہے
جس پر ہزاروں ہی نہیں
لاکھوں حسیں قربان ہو جائیں،

طلسمِ حرف کے جو اسم اس کی آنکھ سے چھلکے
حسین آنکھوں کے سب جادو
جہاں بھر کے ادب کے سارے ہی الفاظ
ان کے سامنے بے معنی لگتے ہیں
مَیں اب تک اپنے مفہوم و معانی ڈھونڈتا پھرتا
مگر جو اسم اس کی آنکھ سے چھلکے
فقط مجھ کو نہیں
سارے جہاں کو اس کے مفہوم و معانی بانٹتے ہیں
اور فقط مَیں ہی نہیں
مجھ ایسے کتنے ہی ادھورے لوگ
ان اسموں کی برکت سے
دلوں کے سُوکھے دریاؤں کو بھر کے
رُوح کی بنجر زمیں سیراب کرتے ہیں،
سبھی اپنے ادھورے پن کی اب تکمیل کرتے ہیں،

شاہراہِ ریشم ــــ دلچسپ حقائق

۱۔ شاہراہِ ریشم تقریباً اُسی تاریخی راستہ پر بنائی گئی ہے جس پر پانچویں صدی میں عظیم چینی سیّاح فاہیان، ساتویں صدی کا ہوانگ تسانگ اور تیرھویں صدی کا مشہور تاجر مارکوپولو گزر چکے ہیں۔

۲۔ یہ شاہراہ ہراموشں، راکاپوشی اور نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں کے قریب سے گزرتی ہے۔ اور دیامر، قراقرم، ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں کو چھوتی ہے۔

۳۔ یہ سڑک دریائے خنجراب، ہنزہ، گلگت اور عظیم دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔

۴۔ سڑک کے ساتھ ساتھ تقریباً پچاس ہزار نفوس کی آبادی ہے۔ جو ۲۰ افراد فی مربع میل بنتی ہے۔

۵۔ گرمیوں میں وادی سندھ سے گزرنے والی سڑک کے سایہ دار درختوں کے نیچے بھی درجہ حرارت ۹۰° فارن ہائیٹ ہوتا ہے جبکہ اسی موسم میں بالائی وادی ہنزہ کا درجہ حرارت ۲۰° فارن ہائیٹ سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

۶۔ سڑک کے دونوں طرف چٹانیں ہیں۔ جو آتشی، متغیر، سنگ خارہ پرت دار یا تہہ دار پتھروں اور روپہلے لاوائی پتھروں پر مشتمل ہیں۔ ہنزہ کے قریب محلول لاوہ، دھماکہ خیز گاد اور تلچھٹ ملی چٹانیں بھی موجود ہیں۔

۷۔ طبقات الارض کے ماہرین کے لیئے یہ شاہراہ جنت اور انجینئرز کیلئے جہنم ہے۔

۸۔ ہنزہ میں تقریباً بارہ چھوٹے بڑے گلیشیر سڑک پر واقع ہیں۔

۹۔ ۱۸۷۳ء میں مام ہل نامی گلیشیر سے رقیق مٹی کا لاوا نکلا تھا جس نے شیشں کوٹ کے مقام پر دریائے ہنزہ کو روک دیا تھا۔ دریائے ہنزہ پر شیشں کوٹ کا پرانا پل آج بھی ساٹھ فٹ گاد کے نیچے دفن ہے۔

۱۰۔ یہ شاہراہ خنجراب کے مقام پر چین میں داخل ہوتی ہے۔ آگے یہ سڑک تاشکان، کاشغر اور پھر ارمچی سے ملتی ہے جو چین کے صوبہ سنکیانگ کا دارالحکومت اور ریل ہیڈ ہے۔

۱۱ - یہ دوہری سڑک ہے جس کی چوڑائی ۳۰ فٹ اور روش ۲۰ فٹ چوڑی ہے۔ سڑک کے بتدریج بلند ہونے کی نسبت ایک اور ۲۵ ہے۔ تمام پل ۲۰ فٹ چوڑے ہیں اور تمام ٹریفک ۳۰ میل فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے چل سکتی ہے۔

۱۲ - دورانِ تعمیر سڑک کی پیمائش گزوں کے حساب سے کی جاتی تھی۔

۱۳ - تعمیر کے پہلے دو سالوں میں پاک فضائیہ نے تقریباً دس ہزار ٹن وزنی سامان منتقل کیا۔

۱۴ - تعمیر میں حصہ لینے والے کارکنوں کی کل تعداد ۲۴ ہزار تھی۔

۱۵ - سڑک پر موجود پل مختلف اشکال کے ہیں۔ کہیں ہموار، کہیں معلق اور کہیں قوس نما ہیں۔

۱۶ - تقریباً آٹھ سو کلومیٹر لمبی سڑک گیارہ سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر ہوئی۔ جو دنیا میں ایک عجوبہ ہے۔

۱۷ - اس سڑک کی تعمیر کے دوران آٹھ ہزار ٹن دھماکہ خیز مواد استعمال کیا گیا۔ اسی ہزار ٹن سیمنٹ اور اتنے ہی وزن کا تیل اور پٹرول خرچ ہوا۔ پینتیس ہزار ٹن کوئلہ جلایا گیا اور ایک ہزار ٹرک مسلسل مصروفِ عمل رہے۔ (زبیر خلیل۔ کراچی)

درخت لگائیے!

اپنے پودے کیلئے دُعا کیجیئے

وہ تیزی سے نشو و نما پائے گا

درخت لگانے اور اُن کی نشو و نما کرنے کا موسم آ رہا ہے۔ اپنے اپنے ماحول اور بالخصوص ربوہ کو خوبصورت، پُر فضا اور صاف ستھرا بنانا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے۔ اِس سلسلہ میں روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین سے ایک چھوٹا سا آرٹیکل ھدیۂ قارئین ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پودوں کے لیئے دُعا کی جائے تو وہ جلد جلد بڑھتے ہیں ——— (منیر احمد جاوید - نائب مدیر)

"جارجیا کے کیمیکل انجنیئرنگ کے ایک پروفیسر ڈاکٹر روبرٹ این ملر نے دعوئی کیا ہے کہ اگر پودوں کی نشو و نما کے لیئے دُعا کا سہارا لیا جائے تو پودوں کے بڑھنے کی رفتار میں حیران کن حد تک اضافہ ہو جائے گا۔ اس سائنسدان نے اپنی دس برس کی تحقیق کو اِس نظریے کی بنیاد بتایا ہے۔

پروفیسر روبرٹ نے اِس سلسلے میں اپنا ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک دفعہ مَیں نے ایک پودا لگایا تو اس کے بڑھنے کی بالکل درست شرح جاننے کے لیئے پودے کے ساتھ ایک ایسا پیمائشی آلہ نصب کیا جو ایک انچ کے ہزارویں حصے کی نشو و نما کو بھی ظاہر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اسی اثناء میں پودوں کی پیوند کاری کا ایک ماہر جوڑا مسٹر اینڈ مسز ایمرز مجھ سے ملاقات کرنے آئے تو مَیں نے اُنہیں یہ پودا دکھایا اور اُن سے درخواست کی کہ جب وہ بالٹی مور میں واقع اپنے گھر واپس جائیں تو اِس پودے کی تیز رفتار نشو و نما کے لیئے دُعا کریں۔ چنانچہ اِن مہمانوں کے بالٹی مور جانے کے چند ہفتوں کے بعد ایک شب ڈاکٹر روبرٹ نے اُنھیں ٹیلی فون کیا اور دُعا کرنے کے بارے میں دریافت کیا۔ مسٹر و مسز ایمرز نے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ ہر شب نو بجے پودے کی نشو و نما کے لیئے دُعا کرتے ہیں اور چشمِ تصور میں پودے کو روشنی، محبّت اور توانائی سے بھرپور ہوتے

ہوتے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر روبرٹ نے مشاہدہ کیا کہ پودا ۹ بجے شب تک ۲۵ر۶ فی ہزار انچ فی گھنٹہ کی عام معمول کی رفتار سے نشو و نما پا رہا ہے جبکہ شب ۹ بجے کے بعد پودے کی نشو و نما کی رفتار ۵۲ر۵ فی ہزار انچ فی گھنٹہ کی شرح کے حساب سے بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ رفتار اگلی صبح آٹھ بجے تک برقرار رہتی ہے۔ یعنی دُعا کی بدولت پودے کی نشو و نما میں ۴۰ر۷ فیصد اضافہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر روبرٹ ہلر کا کہنا ہے کہ یہ پودا لیبارٹری میں معمول کی روشنی، حرارت اور نمی میں پروان چڑھتا رہا ہے اس لئے میں اس کے سوا کوئی اور نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ اس پودے کی تیز رفتار نشو و نما مسٹر و مسز ایمروز کی دُعاؤں کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر ہلر کے مطابق اس تجربے کے بعد اس نے پودوں پر کافی تحقیقی کام کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگر چند لوگ پودے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں تو اس کی نشو و نما کی رفتار میں حیرت انگیز اضافہ ہو گا۔"

(بشکریہ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین ۴ تا ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء)

ہماری درخواست ہے کہ ہر مجلس میں خالد اور تشحیذ کی ایجنسی قائم ہو جائے۔ ایجنسی کیلئے کم از کم ۱۰ رسالے منگوانے ضروری ہیں۔

(مینیجر خالد تشحیذ۔ ربوہ)

وَسِّعْ مَکَانَکَ کے الہام کی ایک عملی تصویر

سرائے خدمت کی دوسری منزل کی تعمیر

مرکزِ سلسلہ میں تشریف لانے والے مہمانانِ کرام کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اُن کے لیے بہتر، سادہ مگر ضروریات پر مکتفی رہائش مہیا کرنے کی غرض سے مختلف ادارہ جات نے اپنے اپنے ذرائع کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے گیسٹ ہاؤسز کی تعمیر کی اور اب حسبِ ضرورت توسیع کر رہے ہیں۔

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ نے اسی مبارک تحریک کی تعمیل میں سرائے خدمت کی تعمیر کی اور اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنے معزز مہمانوں کی خدمت اور ان کو آرام دہ رہائش کی سہولت بہم پہنچانے کا انتظام کرنے کی سعادت پائی۔ اب جماعت کی ضروریات کے پیشِ نظر سرائے خدمت میں توسیع کرنا ناگزیر تھی۔ خدا تعالیٰ کے فضلوں کی اُمید اور اُسی پر توکل کرتے ہوئے سرائے خدمت کی دوسری منزل کی تعمیر کا آغاز کر دیا ہے۔ ہماری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مؤرخہ ۱۶ر جولائی ۱۹۸۳ء بوقت سات بجے شام پُر سوز دعاؤں کے ساتھ اپنے دستِ مبارک سے اس کا سنگِ بنیاد رکھا۔

اب خدا تعالیٰ کے فضل سے تعمیر کا کام بڑی تیزی سے شروع ہے اور چھ لاکھ روپے سے زائد رقم سے تعمیر ہونے والی اس عمارت کی دیواریں چھت تک پہنچ رہی ہیں۔ یہ عمارت انشاء اللہ جلسہ سالانہ تک مکمل ہو جائے گی۔ اور جلسہ سالانہ کے موقع پر بیرون ممالک سے آنے والے مہمانانِ کرام اس عمارت میں قیام فرما سکیں گے۔

اس دوسری منزل کی تعمیر کے جملہ اخراجات عطیات سے پُورے کئے جا رہے ہیں۔ کام کی سرعت اور تیزی کے پیشِ نظر جن احباب نے اِسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تعمیر میں بروقت مالی قربانی پیش کر کے مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کی اعانت فرمائی بغرضِ دعا و نمونہ قابلِ تقلید ان کے اسماء درجِ ذیل کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اخلاص اور مال میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

محترمہ صاحبزادی امۃ الجمیل صاحبہ منجانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰۰/- روپے
۲- " " " " حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۱۰۰/- "
۳- " " " " حضرت مصلح موعود رض ۱۰۰/- "
۴- محترمہ صاحبزادی امۃ الجمیل صاحبہ منجانب حضرت اماں جان رض ۱۰۰/- روپے
۵- " " " " حضرت اُمِّ طاہر ۱۰۰/- "
۶- " " " محترم چوہدری عبد اللہ خان صاحب ۱۰۰/- "

۷- محترمہ صاحبزادی امۃ الجمیل صاحبہ بیگم جناب محترم ناصر محمد صاحب سیال ۱۰۰/- روپے

۸- " " " " " " ۱۰۰/- "

۹- " " " " مکرم ظاہر احمد صاحب ۱۰۰/- "

۱۰- " " " مکرمہ یاسمین احمد صاحبہ ۱۰۰/- "

۱۱- " " " " سعدیہ احمد صاحبہ ۱۰۰/- "

۱۲- " " " " " صوفیہ احمد صاحبہ ۱۰۰/- "

۱۳- مکرم ملک ہارون احمد صاحب کوٹ فتح ضلع اٹک ۵۰۰/- "

۱۴- " چوہدری زبیر احمد صاحب دارالصدر شمالی ربوہ ۱۰۲/- "

۱۵- " ملک حمید الحق صاحب شیخوپورہ ۱۰۰۰/- "

۱۶- " شیخ مشتاق احمد صاحب " ۱۰۰۰/- "

۱۷- " محمود مجیب اصغر صاحب [illegible] ۱۰۰۰/- "

۱۸- " عبدالسمیع سہیل صاحب " ۱۰۰۰/- "

۱۹- " جاوید احمد باجوہ صاحب " ۵۰۰/- "

۲۰- " رشید احمد ملک صاحب معہ اہل وعیال " ۵۰۰۰/- "

۲۱- " قائد صاحب مجلس خدام الاحمدیہ سیالکوٹ ۳۰/- "

۲۲- " شیخ محمود احمد انور صاحب دارالعلوم غربی ربوہ ۱۰۰/- "

۲۳- " حمید احمد ملی صاحب منجانب میاں بشیر احمد علی صاحب والد مرحوم سابق امیر ضلع جھنگ ۵۰۰/- "

۲۴- " چوہدری محمد صدیق صاحب ڈرائیور مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ ربوہ ۵۰۰/- "

۲۵- مجلس خدام الاحمدیہ مقامی ربوہ ۵۰۰۰/- "

۲۶- مکرم عبداللطیف صاحب سکرنڈ ضلع نواب شاہ ۱۰۰/- "

۲۷- " غفور احمد صاحب ۱۰۰/- "

۲۸- مکرم احمد علی صاحب ضلع نواب شاہ ۲۵/- روپے

۲۹- " عبدالحق صاحب " ۱۰۰/- "

۳۰- " فرزند علی صاحب " ۱۰۰/- "

۳۱- " مستری بشیر احمد صاحب " ۱۰۰/- "

۳۲- " مولوی بشیر احمد صاحب " ۵۰/- "

۳۳- " محمد اشرف صاحب " ۵۰/- "

۳۴- " رشید احمد صاحب " ۱۰۰/- "

۳۵- " انور ندیم علوی صاحب قائد ضلع نواب شاہ ۵۰۰/- "

۳۶- " عبداللہ ڈاہری صاحب نواب شاہ ۲۰۰/- "

۳۷- " راشد احمد صاحب ابن مکرم سیٹھ صادق احمد صاحب ۱۰۰/- "

۳۸- " نذر محمد خان صاحب ۵۰/- "

۳۹- " ناصر احمد صاحب الیکٹریشن ۱۰۰/- "

۴۰- " مبارک احمد ناصر صاحب ۵۰/- "

منعقد کی۔ ۳۰ خدام اور ۲۱ اطفال نے شرکت کی۔

★ ماہ جون میں مجلس خدام الاحمدیہ چک 184/7-R ضلع بہاولنگر نے ۸ اجلاس عام اور ۱۲ اجلاس عاملہ منعقد کیئے۔ دوران ماہ مختلف علمی اور ورزشی مقابلے بھی کروائے گئے۔ تمام خدام نے کم از کم ۴۴ دعائیہ خطوط حضور انور ایدہ اللہ الودود کی خدمت اقدس میں لکھے۔ ۶ وقار عمل ہوئے۔ ۸ دفعہ کلوا جمیعًا کیا گیا۔ ۱۵ دن مسلسل نماز تہجد باجماعت ادا کی جاتی رہی۔ ۷۵ افراد تک پیغام حق پہنچایا گیا۔ تبلیغی خطوط بھی لکھے جاتے رہے۔ ۱۴ مریضوں کی عیادت کی گئی۔ ۲۰ مریضوں کو مفت دوائی دی گئی۔ ایک ماہ مسلسل تربیتی کلاس جاری رہی۔ بزم حسن بیان کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ رمضان المبارک کے دوران تمام خدام نے ۲، ۲ بار قرآن کریم کا دور مکمل کیا۔ ماہ جولائی میں ۲۷ رمضان کو جلسہ نزول قرآن بھی منعقد کیا گیا۔ جس میں مقررین نے قرآن پاک کے متعلق مختلف مواضیع پر حاضرین سے خطاب کیا۔

خریداران خالد اپنے تبدیلی پتہ کی اطلاع ضرور دفتر کو دیتے رہا کریں۔ (مینیجر ماہنامہ خالد۔ ربوہ)

مجلس خدام الاحمدیہ کا سالانہ اجتماع

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کا انتالیسواں سالانہ اجتماع خدا تعالیٰ کے فضل اور اسکی دی ہوئی توفیق کے ساتھ انشاء اللہ العزیز ۲۱-۲۲-۲۳ اخاء ۱۳۶۲ھش بمطابق ۲۱-۲۲-۲۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء اپنی شاندار روایات کے ساتھ **ربوہ** میں منعقد ہوگا۔

خدام الاحمدیہ اپنے اس اجتماع کے لئے ابھی سے تیاری شروع فرمائیں۔

صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ

KHALID RABWAH

Regd. No..L5830 Editor : Mirza Mohammad Din Naz AUGUST 1983

ایک بہت ہی پیارا سلسلہ کا خادم حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گیا

مولانا عبدالمالک خان صاحب سابق ناظر اصلاح وارشاد ایک تبلیغی سفر پہ جاتے ہوئے ۵؍ اگست بروز جمعہ شیخوپورہ کے قریب کار اور ٹرک کے تصادم میں زخمی ہوئے اور بروقت طبّی امداد نہ ملنے کے باعث اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مسجد اقصیٰ میں خطبۂ ثانیہ کے دوران جو اس عظیم مجاہد کو خراجِ تحسین پیش فرمایا وہ درج ذیل ہے :-

"آج ایک انتہائی دردناک واقعہ کی وجہ سے دل بہت ہی مغموم ہے ایک گہرا زخم لگا! ایک بہت ہی پیارا سلسلہ کا خادم مولانا عبدالمالک خان صاحب تبلیغی جہاد کے سفر پر جاتے ہوئے شیخوپورہ کے قریب ایک حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ (رقّت آمیز لہجہ میں حضور نے فرمایا) تھوڑی دیر قبل لاہور سے فون پر یہ اطلاع ملی ہے۔ ہمارے دل بے حد مغموم ہیں۔ مرحوم نہایت فدائی اور سلسلہ کے خادم تھے۔ آپ ہندوستان کے چوٹی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے اللہ کی خاطر دنیا کی عزت کو ٹھکرایا اور دین کی خدمت کی زندگی قبول کی۔ ان کے والد نے ان ساری دنیاوی عزتوں کو تج کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دامن تھاما اور اللہ کی خاطر امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ چھوڑ کر غریبانہ زندگی اختیار کی۔ اسی رنگ میں رنگین ہو کر مولانا عبدالمالک خان صاحب نے بھی اپنی زندگی دین کی خاطر وقف کی اور اس وقف کے تقاضوں کو خوب نبھایا۔ گرمی سردی یا کسی مشکل مصیبت میں بھی خدمتِ دین کا کوئی موقعہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ابھی کل ہی مجھے ملے اور اپنے سفر پر جانے کی اجازت مانگی اور خدمتِ دین کے ایک خاصے طویل سفر کا پروگرام پیش کیا۔

میں نے انہیں کہا آپ کی صحت کمزور ہے، آپ کا پاؤں زخمی ہے، آپ شوگر کے مریض ہیں، آپ اتنا سفر نہ کریں۔ یہ آپ کی صحت پر بوجھ ہوگا۔ مولوی صاحب نے کہا بوجھ کیسا! میں تو خدمتِ دین پہ روانہ ہو کر اتنا خوش ہوتا ہوں کہ دل کھِل اٹھتا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں اس دینی سفر پر روانہ ہو جاؤں۔ میں تو جتنا سفر کرتا ہوں طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انکے اس جذبے کو قبول کیا اور اسی سفر کی حالت میں اپنے پاس بلا لیا۔ افراد مر جاتے ہیں اور قومیں زندہ رہتی ہیں۔ زندہ قومیں قطعاً اس بات کی پرواہ نہیں کرتیں اور بحیثیت قوم ہم ایک زندہ قوم ہیں۔ جانے والوں کا دکھ ضرور ہے مگر مایوسی کوئی نہیں۔ اللہ چاہے تو ہر جانے والے کے مقابل ہمیں لاکھوں ایسے افراد عطا کر دے۔ دعا کریں اور یہ عہد کریں کہ اللہ تعالیٰ ایک عبدالمالک کو بلائے تو ہم اس کی جگہ سو عبدالمالک پیدا کر دیں گے"۔